ISSN 0974-7346

اکتوبر ۲۰۲۶ء

جلد۲۱۳ــــعدد ۱۰

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ



دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank
اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051
آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:
info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۳ ماہ ربیع الآخر ۱۴۴۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۲۶ء عدد ۱۰

مجلس ادارت
پروفیسر ڈاکٹر تقی الدین ندوی
پروفیسر شریف حسین قاسمی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مرتبہ
ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سیکریٹری:
ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر:۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات — محمد عمیر الصدیق ندوی ۴

مقالات

جنوبی ہند میں سیرت نگاری — ڈاکٹر راہی فدائی ۷

حضرت علی بن ابی طالب کرّم اللہ وجہہ شیخ العالم کے کلام میں نوجوانوں کے لئے ہدایت — ڈاکٹر ظفر الاسلام خان ۲۳ — اشتیاق احمد وگے ۳۲

منشی پریم چند کی کہانیوں کے عربی تراجم — پروفیسر حبیب اللہ خان ۴۸

مسلمانوں میں عصری تعلیم کا رجحان ایک جائزہ — محمد ثاقب ۵۸

اخبار علمیہ — ک۔ص اصلاحی ۶۷

آثار علمیہ — پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی ۶۸

تبصرۂ کتب — ع۔ص، ک۔ص اصلاحی، ف۔اصلاحی ۷۲

ادبیات

حمد باری تعالیٰ — ڈاکٹر راہی فدائی ۸۱

رسید کتب موصولہ ۸۲

شذرات

وقت کی گردش میں کوئی فرق نہیں، اس کی اپنی مقررہ رفتار ہے لیکن وقت کے اثرات کے بننے، پھیلنے، بگڑنے اور سمٹنے میں تغیر پذیری کا عمل بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ صدائے کن فیکون کی بازگشت بھی وقت کی ایک پہچان ہے۔ گو اس کی حد مقرر نہیں۔ یہ بھی طے نہیں کہ شام وسحر جس کی نمود کے لیے گرم سیر ہیں اس کے وجود کی یافت کے لیے انتظار کی کتنی ساعتوں کا شمار ہوتا رہے گا۔

***

دنیا اور خاص طور پر ملک عزیز میں زندگی جس طرح شانۂ روزگار پر بار گراں بنتی جاتی ہے۔ خاص طور پر گزشتہ ایک دہائی کے عرصہ میں اس ملک پر جو گزری ہے اس کا اندازہ ملک کی صحافت خصوصاً اردو صحافت سے کیا جاسکتا ہے۔ معارف کے شذرات کبھی علم و معرفت، ادب و ثقافت، رشد و نصیحت اور بصیرت و ہدایت کے نور سے معمور ہوا کرتے تھے اور ملکی اور عالمی سیاست پر ایک نگاہ غلط انداز کے بھی منکر نہ تھے۔ آزادی وطن کے بعد ان شذرات میں آہستہ آہستہ شکست خواب کی کیفیتوں کا احساس بڑھتا گیا۔ آزادی کے دلفریب اور رومانی تصور نے ایک محب وطن شہری کے ارمانوں اور خوابوں کو بجا طور پر ہوا دی کہ ملک اپنا ہے، حاکم اپنے ہیں، ملک کی ترقی اور بہبود کے جذبے اپنے ہیں تو مذہب، زبان، تہذیب، تعلیم اور تمول کے تحفظ اور حصول کے لیے انصاف اور مساوات جیسی صفات ہر قدم پر دستیاب ہوں گی۔ ملک میں ہر جائز خواہش کے پورے ہونے کے سامان ہوں گے اور اس طرح یہ ایک بار پھر جنت نشان کی شناخت سے سرفراز ہو گا۔ نصف صدی سے زیادہ کا وقت زندگی نے لے لیا، ملک کی بیشتر آبادی، تعبیر خواب کے لیے وقت کی لکیروں سے سوال کرتی رہی، خاص طور پر ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے لیے مسائل کی ایسی یورش ہوئی کہ زبان، تہذیب، عقیدہ، روایت سب زد پر آگئے۔ معارف کے شذرات جن کے متعلق ایک بار محقق کبیر ڈاکٹر حمید اللہ نے کہا تھا کہ یہ شذرات ہماری تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ اور ماخذ ہوں گے۔ آزادی کے بعد ان شذرات میں قوم کے زوال یا قوم کی ابتلاء و آزمائش کا درد، چھپا نہیں رہ سکا۔ لیکن اظہار درد میں بھی ایک تمکنت تھی۔ معاندین کے ترکش کا ایک تیر یہ بھی نکلا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے ارسطو، افلاطون، سقراط، بقراط، جالینوس، رستم، سہراب، افراسیاب وغیرہ غیر ہندوستانی شخصیتوں کو اپنایا۔ اپنے ادب اور لٹریچر میں ان کو جگہ دی اور ہندوستانیوں کو بھول گئے تو جواب میں شذرات میں کہا گیا کہ اس کا جواب تو خود معترضین کو سوچنا چاہیے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں کوئی بڑی شخصیت پیدا نہیں ہوئی لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی علاحدگی

گئے تو جواب میں شذرات میں کہا گیا کہ اس کا جواب تو خود معترضین کو سوچنا چاہیے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں کوئی بڑی شخصیت پیدا نہیں ہوئی لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی علاحدگی پسندی اور دوسری قوموں سے چھوت کی بنا پر ان کے اوتاروں اور قدیم مصلحین کے علاوہ کسی اور صاحب کمال نے کوئی بین الاقوامی شہرت حاصل نہیں کی۔ پرانی ہندو سوسائٹی اپنے اوپر غیر قوموں کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیتی تھی۔ یہ جملے یہاں دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے حقائق کو بیاں کرنے میں کسی مصلحت یا خوف کا ماحول بہر حال نہیں تھا مگر ادھر دس بارہ سال کی مدت میں خیالات اور جذبات کے اظہار پر خوف اور دہشت کے سایے جس طرح دراز ہوئے، اس کا تصور بھی ہندوستانی جمہوریت کے حاشیۂ خیال میں نہ آیا ہوگا۔ اب عالم یہ ہے کہ اقلیتوں ہی نہیں زیر دست اور کمزور طبقوں کے لیے ہر روز کی صبح، ایسی خبروں کے ساتھ نمودار ہوتی ہے جن سے تشویش اور تشویش سے فکر اور فکر سے اندیشوں اور خطروں کی خوفناکی اور بڑھ جاتی ہے۔

***

ستمبر کے مہینے کے پورا ہونے میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے لیکن اس ماہ کے اخبارات کو دیکھا جائے تو مسلم صحافی خواتین پر مذہبی شناخت کی بنیاد پر پولیس کا تشدد، وندے ماترم نہ پڑھنے پر اسکولوں کی امداد بند کرنے کی دھمکی، سہارن پور کی سو سالہ قدیم مسجد کے انہدام اور اس کے انصاف کے لیے عدالت میں دی گئی درخواست کا خارج ہونا، جوہر ٹرسٹ سے پانچ سو کرور روپے جرمانہ کی وصولیابی کی تیاری، مرشد آباد کے ایک معمر بزرگ کو راتوں رات گھر سے اٹھا کر بنگلہ دیش بھیج دینا، ممبئی ایئرپورٹ کی مسجد کی پانی سپلائی کو منقطع کرنا، قرآن مجید سے متعلق ہرزہ سرائی، غزہ کے بچوں سے اظہار یک جہتی کی پاداش میں سزا جیسی خبروں سے اخباروں کی سرخیاں ایک نفرت انگیز نظریے کی سیاہیوں کا اعلان ہوتی نظر آتی ہیں۔ کولکاتا میں ایک بار پھر ایک نوجوان مسلم تاجر کو ہجوم کے ذریعہ مویشی چور کہہ کر پیٹ پیٹ کر قتل کر دیا گیا۔ ماب لنچنگ کا سلسلہ جیسے کبھی نہ ختم ہونے کے لیے ہے۔ ایک مہینے سے بھی کم عرصے میں حقوق انسانی کی پامالی کی یہ چند مثالیں ہیں۔ ان کو جاننا اور پھر وقت کی یادداشت کے حوالے کر دینا، یہ بھی مقابلہ اور مدافعت کی ایک شکل ہے۔ وقت کی گردش کبھی نہ کبھی فیصلے کرنے کے لمحات سامنے لے ہی آتی ہے۔

***

یہ ہندوستانی سماج کی توہین ہے کہ اس کی لغت میں ماب لنچنگ کا لفظ، در ہی نہیں آیا، زبان زد خاص وعام ہو گیا۔ خدا جانے ۱۷۸۰ء میں پیدا ہونے والے ایک بحری کپتان مسٹر ڈبلو لنچ کا کیا گناہ تھا کہ ہلاکت، سفاکی، غیر قانونی سزا کے لیے یہ لفظ خاص ہو گیا اور ہندوستان میں دس بارہ برسوں میں جب کہ دنیا دہشت گردی کے شور وغوغا میں مبتلا تھی ملک میں ماب لنچنگ نے دہشت گردی کی ایک انوکھی تصویر پیش کر دی۔ تصویر تو پہلے ہی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں تشدد اور ہلاکت خیزی کے حامل اس فعل کے لیے بی ویل برنٹ نے لکھا تھا کہ یہ صرف ایک یا چند انفرادی لوگوں پر ظالمانہ عمل نہیں بلکہ یہ انسانیت اور معاشی تحفظ کے خلاف بھی متشددانہ جارح رویہ ہے۔ ہندوستان میں ماب لنچنگ کا مطلب یہ ہوا کہ کسی نہتے، تنہا، بے بس انسان پر ایک جنونی بھیڑ کسی بھیڑیئے کی درندگی کا نمونہ بن جائے اور پھر یہ نمونے اتنی کثرت سے سامنے آئے کہ غیر زبان کا ایک لفظ کسی کے لیے غیر مانوس نہیں رہا۔ اور یہ صرف اقلیت ہی نہیں دوسرے کمزور طبقوں پر ظلم کی علامت بن گیا۔ ۲۰۱۴ء میں صرف ایک واقعہ سے شروع ہونے والا یہ انسانیت دشمن جرم، دس سال میں سینکڑوں کے عدد سے بھی تجاوز کر گیا۔ ضرورت تھی کہ عوام کی یادداشت کے لیے ایک دستاویز ہوتی جو ملک بھر میں اس جرم میں شامل ایک ایک لمحہ بلکہ ظلم کی ایک ایک آہ، گناہوں کا حساب کرنے کے لیے محفوظ کر لی جاتی۔ یہ نہایت دشوار کام تھا لیکن عزم کے ساتھ انسانیت کی بھلائی اور ملک سے محبت کا جذبہ ہو تو ناممکن کو ممکن بننے کی مثالیں مفقود نہیں۔ چند دنوں پہلے سات سو چھیالیس صفحات کی بڑی تقطیع پر ماب لنچنگ کے نام سے انگریزی زبان میں "ماب لنچنگ ان انڈیا" کے نام سے ایک عظیم اور نادرالمثال دستاویزی کتاب کا اجرا دہلی میں عمل میں آیا۔ مشاہیر مفکروں اور دانشوروں کی موجودگی نے اس کتاب کی اہمیت کو اور بھی نمایاں کر دیا۔ محققین اور مرتبین کی ایک جماعت کی سالہاسال کی کاوشوں کو ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں نے اپنے سلیقۂ جمع وترتیب سے ایک شاہکار میں بدل دیا۔ یہ کتاب صرف مستقبل کے مورخ کے لیے ایک وثیقہ ہی نہیں ملک کے حالات پر نظر رکھنے والے سنجیدہ ذہنوں کے لیے بھی ایک صدائے جرس ہے۔ ساڑھے سات سو سے زیادہ صفحات کی یہ دستاویز صرف نو سو روپے میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر کتب خانے میں یہ کتاب مطالعہ کے لیے دستیاب ہو اور صرف انگریزی ہی نہیں دوسری اور ہندوستانی زبانوں میں بھی یہ اپنا پیغام ملک عزیز کے دلوں تک پہنچا سکے۔

***

جنوبی ہند میں سیرت نگاری

ڈاکٹر راہی فدائی
drrahifidai@gmail.com

"سیرۃ" عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی طریقہ، عادت، ہیئت وغیرہ کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں "سیرت" رسول اکرمؐ کے طریقۂ زندگی، آپؐ کے اسوۂ حسنہ اور آپؐ کی حیات طیبہ کے ہمہ جہت احوال و آثار کا نام ہے۔ جب احکم الحاکمین نے اہل ایمان پر حکم "اطیعوا الرسول" کے ذریعے رسول اکرمؐ کی اطاعت و اتباع کو لازمی قرار دیا ہے تو فرماں برداری و تعمیل حکم کے لئے آپؐ کے شب و روز کے مشاغل اور آپ کے گفتار و کردار سے آگاہی ضروری ہے۔ اسی ضرورت کے تحت آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آپؐ کے قول و فعل اور تقریر[1] کو جنہیں احادیث شریفہ کہا جاتا ہے، نہ صرف جمع کیا بلکہ اس کی اشاعت کی ذمہ داری بھی بحسن و خوبی ادا کی۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ہزاروں صحابۂ کرام کے بیان کردہ احادیث کسی منضبط پیرائے میں نہیں تھے بلکہ اس طرح منصوبہ بند کام کرنا اس دور میں ممکن بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روایت حدیث کے ضمن میں آپؐ کی حیات طیبہ کے مختلف و متنوع حالات و واقعات کا ارتباط و تسلسل نہیں رہا۔ اسی مسئلے کا احساس کرتے ہوئے بعض تابعین کرام نے مربوط سیرت نگاری کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ چنانچہ سب سے پہلے اس گرانقدر فریضے کو انجام دینے کے لئے آگے بڑھنے والے حضرت اسماء بنت ابو بکر صدیقؓ کے فرزند حضرت عروہ بن زبیرؓ بن عوام (۲۲-۹۳ھ) تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کا اسم گرامی سیرت رسولؐ پاک کے اولین قلمکاروں میں شامل ہے۔ حضرت عروہ کا شمار مدینہ منورہ کے "فقہائے سبعہ" (سات فقہا) میں ہوتا ہے۔ آپ کی ذات والا صفات سیرت و مغازی کے ضمن میں تاریخ نگاری کی مؤسس اور بانی کی حیثیت سے ممتاز ہے۔[2]

---

[1] یعنی جس عمل یا چیز کو آپؐ نے دیکھا اور اسے پسند فرمایا یا منع نہیں کیا (مدیر)۔

[2] خلیل ابراہیم (مقالہ نگار)، محمد اجمل اصلاحی (مترجم)، "پہلے سیرت نگار، عروہ بن الزبیر"، مجلہ "نقوش" لاہور، رسول نمبر، ص ۳۹۸

حضرت عروہ کے بعد متعدد اہل قلم نے سیرت نگاری کے میدان میں خامہ و قرطاس کی جولانیاں بکھیریں۔ ان نفوس قدسیہ میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت عامر بن شرجیل الشعبی (۱۹-۱۰۳ھ)، حضرت ابان بن عثمان بن عفانؓ (۲۰-۱۰۵ھ)، حضرت وھب بن منبہ (متوفی ۱۱۴ھ)، حضرت محمد بن شہاب الزہری (متوفی ۱۲۱ھ) وغیرہ۔ علاوہ ازیں مشہور و معروف محدث و مؤرخ محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۰ھ) کا شمار وفیات مصنفین سیرت کے اعتبار سے اور سنین کی ترتیب میں اٹھائیسویں (۲۸) نمبر پر ہوتا ہے۔[۳] اس سے پتہ چلتا ہے کہ مؤرخ ابن اسحاق سے پیشتر ستائیس سیرت نگاروں کے نام موجود ہیں۔

فارسی زبان میں سیرت رسول اکرمؐ پر مستقل کتابیں ابتدائی دور میں تصنیف نہیں ہوئیں، البتہ عربی سیر کی کتابوں کے ترجمے اور تلخیصیں وجود پذیر ہوتی رہیں، مثلاً سیرت ابن ہشام (ابو محمد عبد الملک بن ہشام المعافری متوفی ۲۱۳ھ) کا خلاصہ و ترجمہ رفیع الدین اسحاق بن محمد ہمدانی (متوفی ۶۲۳ھ) نے بعنوان "سیرۃ رسول اللہ" کیا تھا۔ اس طرح ابو سعد خرگوشی (متوفی ۴۰۶ھ) کی تصنیف "شرف النبی" کا فارسی ترجمہ امام نجم الدین محمود بن علی راوندی (متوفی ۶۰۶ھ) نے کیا۔[۴] تقریباً یہی صورت حال برصغیر ہندوپاک کی علمی و ادبی فضا کی رہی ہے۔ یہاں فارسی زبان کی مستحکم روایات کے مدّ نظر بہت عرصے بعد سیرت النبویؐ کی تخلیق کو خاطر خواہ مقام حاصل ہوا۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی کی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی (۶۸۴ھ-۷۵۸ھ) مؤلف تاریخ فیروز شاہی و فتاوائے جہانداری نے ستر (۷۰) سال کی عمر میں "صحیفۂ نعت محمدی" کے عنوان سے سیرت النبیؐ پر معرکہ آرا کتاب سنہ ۷۵۴ھ / ۱۳۵۳ء میں تصنیف کی۔[۵]

فارسی جیسی قدیم زبان کے بعد، جس نے شہنشاہ کونین ﷺ کی سیرت طیبہ کو اپنی علمی و ادبی سرمایے کی زینت بنانے کے لئے سات صدیوں کا عرصہ صرف کیا تھا، برصغیر ہندوپاک کی محبوب زبان جسے ہندی، ہندوی، ہندوستانی اور اردو وغیرہ ناموں سے یاد کیا گیا، اپنی خوبصورتی، رعنائی اور

---

[۳] محمد عبد اللہ اعظمی معروف بہ ضیاء الرحمن اعظمی، "سیرۃ المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم الصحیحہ" (الجزء الاول)، الھیئۃ العامہ للعنایۃ بطباعۃ ونشر القرآن الکریم والسنۃ النبویۃ"، ۱۴۴۲ھ / ۲۰۲۱ء، ص۹

[۴] ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب نے فون کال کے ذریعہ مذکورہ معلومات بہم پہنچائی ہیں، جس کے لئے راقم بصمیم قلب شکر گذار ہے۔

[۵] عارف نوشاہی، "کتاب شناسی آثار فارسی، چاپ شدہ در شبہ قارہ" (جلد ۶) مرکز میراث مکتوب تہران، ص ۳۸۵۷

حسن ادا کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔ عربی و فارسی جیسی قدیم روایات کی حامل زبانوں کے برعکس ایک نوخیز زبان نے اپنی جوانی اور نوعمری ہی میں حضور اکرم ﷺ کی سیرت پاک کے روشن نقوش تلاش کرنے اور انہیں اپنی زبان کا گرانقدر سرمایہ بنانے کی کوشش کی۔

اردو میں سیرت نگاری کی ابتدا منظوم معراج ناموں، مولود ناموں وغیرہ سے ہوئی۔ سب سے پہلے "معراج نامہ" تخلیق کرنے کی سعادت عہد قطب شاہی کے معروف شاعر سید بلاقی (متوفی ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء) کو حاصل ہوئی۔[۶] پندرہ سو اشعار پر مشتمل یہ طویل "معراج نامہ" حضور اکرم ﷺ کے سفر لامکانی، دیدار خداوندی اور مشاہدۂ غیبی کے عجیب و غریب واقعات پر مشتمل ہے۔ بلاقی کا یہ منظوم شاہکار صدیوں تک عوام و خواص کی محفلوں میں دلچسپی سے پڑھا جاتا رہا ہے، چنانچہ آسٹریائی مستشرق آلویس اسپرنگر Aloys Sprenger (متوفی ۱۸۹۳ء) کے مطابق حضرت بلاقی کا معراج نامہ ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھنو میں مشہور و متداول رہا ہے۔[۷]

حضرت بلاقی کی طرح معراج نامے تحریر کرنے والے ممتاز قلمکاروں میں جنوب کے سلسلۂ اقطاب کے فرد فرید عارف و شاعر حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی ویلوریؒ (ولادت ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء وفات ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء) اور بارہویں صدی ہجری کے نامور صوفی و سخنور جامیٔ دکن حضرت سید شاہ کمال کڈپوی (متوفی ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء) کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ یہ معراج نامے، میلاد نامے، ضیافت نامے وغیرہ سیرت پاک کے کسی نہ کسی روشن پہلو کو عوام کا منظر نامہ بنانے، ان کی عقیدتوں کو صیقل کرنے اور انہیں حضور پر نورؐ کی پیروی کی طرف متوجہ کرنے کے لئے رقم کئے جاتے تھے۔ اردو زبان میں تخلیق شدہ مذکورہ بالا ان جزوی منظومات کے باوجود ایک مکمل سیرت طیبہ کی ضرورت و اہمیت مدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ اس صورتحال کے مد نظر اردو کے اولین نقاد[۸] عظیم شاعر و ماہر لسانیات علامہ باقر آگاہ ویلوریؒ

---

[۶] محی الدین قادری زورؔ، "دکنی ادب کی تاریخ"، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ ۱۹۹۳ء ص ۶۸

[۷] گارساں دیتاسی، تاریخ ادبیات اردو (جلد سوم)، پاکستانی اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۵ء، ص ۲۱۵۔ یہ گارساں دیتاسی کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ لیلیان (Liliane) نے کیا۔ اس کی ترتیب نو اور تدوین و تقدیم ڈاکٹر معین الدین عقیل نے کی۔

[۸] راقم الحروف (راہی فدائی) نے اردو دنیا کو سب سے پہلے یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ اردو ادب میں نقد و انتقاد کی داغ بیل ڈالنے والے اولین شخص علامہ باقر آگاہ تھے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کے مقدموں میں تنقید کی کیفیت و حیثیت پر خوب گفتگو

(۱۱۵۸ھ-۱۲۲۰ھ / ۱۷۴۵ء-۱۸۰۵ء) نے برّصغیر ہندوپاک میں پہلی بار مکمل و مدلل منظوم سیرت بعنوان "ہشت بہشت" رقم فرمائی، جس میں صحیح احادیث، معتبر روایات اور مستند اخبار کو شامل مضمون کیا گیا۔ نو(۹)ہزار اشعار پر مشتمل یہ ضخیم کتاب دکنی زبان میں ہے، جس کا اسلوب سادہ، صاف اور شستہ رکھا گیا ہے تاکہ اس دور کے قارئین اس سے کماحقہ استفادہ کرسکیں اور سیرت مصطفی کو اپنی زندگیوں میں رائج کرسکیں۔ علامہ آگاہ سے پیشتر دکنی کے عظیم شاعر ملک محمد جائسی (۹۴۹ھ/ ۱۵۴۲ ء)، اس معرکہ آرا مثنوی پدماوت کے مترجم، روضۃ الشہداء و روضۃ العقبٰی کے مصنف و مؤلف میر ولی فیاض معروف بہ ولیؔ ویلوری (متوفی بعد ۱۱۶۲ھ) نے مثنوی "روضۃ الانوار" سیرت النبیؐ کے موضوع پر ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء میں تحریر کی تھی۔ بقول پروفیسر غلام مصطفی خان وہ دو ہزار دو سو چالیس اشعار پر مشتمل ہے، مگر پروفیسر موصوف کی رائے ہے کہ "روضۃ الانوار"، فارسی کی مشہور سیرت کی کتاب "مطالع الانوار" جس کے مصنف عفیف نور کاشانی (دسویں صدی ہجری) ہیں، کا ترجمہ ہوسکتا ہے۔[۹] چونکہ ولیؔ ویلوری کی مثنوی پر طبع زاد تصنیف ہونے میں شکوک و شبہات ہیں، اس لئے ولیؔ ویلوری کو دکنی کا اولین مستقل سیرت نگار نہیں کہا جائے گا۔ "ہشت بہشت" کا تعارف کراتے ہوئے "خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار" کے مصنف نے جو نکات بیان کئے ہیں وہ قابل غور ہیں:

"ہشت بہشت" (سال تصنیف ۱۱۸۵ھ تا ۱۲۰۶ھ) یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو حضور اکرمؐ کی ذات و صفات، حالات و کمالات اور خصوصیات و معجزات پر مشتمل ہے۔ اس کے جملہ اشعار کی تعداد نو ہزار ہے۔ یہ دراصل آٹھ مختلف و مکمل رسالوں کا مجموعہ ہے، جن میں سے ہر ایک کے لئے مستقل حمد، نعت، منقبت غوث اعظم اور مدح مرشد کے علاوہ الگ الگ اوزان کا بھی التزام کیا گیا ہے۔[۱۰] اس کے اشعار میں یہ شامل ہے:

کی۔ راقم کی مذکورہ تحقیق کو پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے سراہا اور اس کی تائید "مثنوی ندرت عشق" کے دیباچہ میں فرمائی۔ علامہ آگاہ کی معرکہ آرا مثنوی "ندرت عشق" پہلی بار راقم نے ایڈٹ کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ ۲۰۱۸ء میں "کرناٹک اردو اکادمی" بنگلور کے توسط سے شائع کی۔

[۹] غلام مصطفی خاں، "ولی کے متعلق کچھ اور"، معارف، جنوری ۱۹۴۰ء، ص ۵۰۔ ولی ویلوری کی مثنوی "روضۃ الانوار" کا قلمی نسخہ ڈاکٹر غلام مصطفی خاں (متوفی ۲۰۰۵ء در سندھ) کی تحویل میں تھا، جس کی اطلاع ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کی ابتدا میں دی۔

[۱۰] راہی فدائی، خانوادۂ اقطاب ویلور کے علمی آثار، الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر، حیدرآباد، ۲۰۱۶ء ص ۱۲۶

سن تو دل کے کان سے اب یہ بیاں
مصطفیؐ کے عصر سے تا ایں زماں
گزرے ہیں جو اولیا اور عالماں
متفق اس بات پر ہیں بے گماں
کہ نبیؐ کا ذکر ہر شام و سحر
افضل الاذکار ہے اے باخبر
بلکہ جو ہیں مصطفیٰ کے ذکر میں
ہیں بلاشک وہ خدا کے ذکر میں
ہوے اوس کے ذکر سے افلاس دور
ہوئے اوس کے ذکر سے خناس دور[۱۱]

علاوہ ازیں علامہ آگاہؔ نے سیرت النبیؐ کے موضوع پر ایک مختصر نثری رسالہ ریاض السیر بھی تحریر کیا تھا، جس کے صفحات ایک سو اٹھائیس ہیں۔ اس کا مخطوطہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) حیدرآباد میں موجود ہے۔ اس کتاب کا آغاز اس طرح ہے:

تمہیدات بے نہایت اور تمجیدات بے غایت ثابت ہے اس ذات خدائے بے ہمتا، بے چوں وبے چگونہ، بے شبہ وبے نمونہ کو کہ مماثل سے پاک، عیب ونقصان سے مبرا، ظلم وتعدی سے منزہ، واحد، احد، صمد، فرد یک اکیلا ہے۔[۱۲]

حضرت آگاہؔ کی منظوم سیرت "ہشت بہشت" (۱۲۰۶ھ) کے تقریباً پچاسی سال بعد سیرۃ النبی ﷺ کے موضوع پر علامۂ وقت حضرت شاہ عبدالحی احقرؔ بنگلوری کی معرکۃ الآرا منظوم تصنیف "جنان السیر فی احوال سید البشر" سنہ ۱۲۹۳ھ میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔ یہ ضخیم تصنیف تقریباً بیس ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اس گرانقدر کتاب کو دو دفتروں یعنی دو حصوں میں

---

[۱۱] قاضی امۃ الرحیم، انکشاف باقر آگاہ ویلوری، ہشت بہشت کے تناظر میں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۲۳ء، ص ۱۱۰-۱۱۱

[۱۲] خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار، ص ۱۵۴

تقسیم کیا گیا ہے۔ مذکورہ دو حصوں کو دس چمنوں یعنی دس ابواب سے زینت بخشی گئی ہے۔

حضرت احقؔر کی شخصیت جامع الکمالات تھی۔ بقول مصنف "خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار":

> آپ نے علوم اسلامیہ کا معتد بہ حصہ اردو میں منتقل کیا۔ آپ سے پیشتر یہ کارنامہ صرف علامہ باقر آگاہؔ ویلوری نے سرانجام دیا تھا۔ مگر آگاہؔ کے پاس واقعات کا تفصیلی جائزہ اور علوم وفنون کا اس قدر تنوع نہیں ملتا جس قدر کہ حضرت احقؔر بنگلوری کے یہاں پایا جاتا ہے۔
>
> یہاں "جنان السیر" سے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جارہے ہیں:
>
> دے مجھے ہر کام میں یا رب خلوص
> نظم میں اس بار چمن کے خصوص
> جلد دے ہر ایک چمن کو بہار
> شجر مناجات کو دے میرے یار
> ہر گل و غنچہ کو بہ یُمن رسول
> اس کے عطا کیجئے رنگ قبول
> جلد دے انجام اسے باکمال
> بدر بنادے یہ منور ہلال[۱۳]

حضرت احقؔر نے لوگوں کی خواہش پر ایک مختصر نثری رسالہ سیرت پاک کے موضوع پر تحریر کیا تھا جس کا نام "خلاصۃ السیر" رکھا تھا۔ یہ رسالہ تقریباً دوسو صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔[۱۴] "خلاصۃ السیر" کی تصنیف غالباً ۱۲۵۹ھ میں ہوئی، اس کے بعد ہی "جنان السیر" تحریر کرنے کی طرف آپ نے توجہ مبذول کی۔ "جنان السیر" کا چمن اول ۱۲۶۲ھ میں رقم کیا گیا۔[۱۵]

تیرہویں صدی ہجری ہی میں ایک اور سیرت نگار کا جلوہ تابندہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہیں مولانا حاجی محمود مہاجر المتخلص بہ حسرؔت۔ حضرت مہاجر حسرؔت کا تعلق "قوم نوائط" سے اسی طرح ہے

---

[۱۳] عبدالحی شاہ احقر بنگلوری، جنان السیر، ہمدرد بک ڈپو، بنگلور، ۱۳۸۶ھ، ص:۲۹

[۱۴] سراج احمد قادری، "دبستان نعت" شمارہ۹؛ مقالہ دکن کا زندۂ جاوید منظوم صحیفہ سیرت طیبہ از بشیر الحق قادری، ص ۱۹۱

[۱۵] خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار، ص ۲۴۷

جیسے علامہ باقر آگاہ علیہ الرحمہ کا رہا ہے۔ آپ شہر مدراس کے متوطن تھے۔ لفظ "مہاجر" خاندانی لقب ہے۔ حضرت حسرتؔ اقطاب ویلور کے چشم و چراغ حضرت سید شاہ ابوالحسن محوؔی قادری ویلوری (۱۱۸۶ھ-۱۲۴۳ھ) کے شاگرد و خلیفہ تھے۔ آپ کی شخصیت علم و عرفان سے آراستہ ہونے کے ساتھ خدا ترسی، سادگی اور منکسر المزاجی کی پیکر تھی۔ آپ کے تفصیلی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ حضرت حسرتؔ کو اپنی عمر کے آخری حصہ میں یہ خیال ستانے لگا کہ میں نے تاحال کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے حیات جاوداں نصیب ہو۔ ایسے میں اک روز الہاماً دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ انہیں اپنے دادا پیر یعنی اپنے مرشد و مربی حضرت محوؔی کے والد ماجد ماہر علم و ادب حضرت سید شاہ عبداللطیف ذوؔقی قادری ویلوریؒ (۱۱۵۱ھ-۱۱۹۴ھ) کی سیرت پاک پر فارسی میں تحریر کردہ معرکۃ الآراء مثنوی "معجز مصطفی" (مرقومہ ۱۱۸۰ھ) کا بزبان اردو ترجمہ کیا جائے تاکہ ہندوستان کے عوام و خواص کو استفادہ کا زریں موقع ہاتھ آئے۔ حضرت شاہ ذوؔقی کی مذکورہ مثنوی "معجز مصطفی" تقریباً ساڑھے سات ہزار اشعار پر محیط ہے۔ حضرت ذوؔقی نے اسے صرف ڈیڑھ ماہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ کار خیر سنہ ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ء میں بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا تو آپ نے اپنی تصنیف کا نام "ریاض سیر" رکھا۔ اس کے اشعار کی تعداد اصل متن کے مساوی سات ہزار سے زائد ہیں۔[۱۶] حضرت حسرت نے مذکورہ امور کا اعتراف اپنے اشعار میں یوں کیا ہے:

مرے جی میں یک روز آئی یہ بات
کہ کچھ زندگی کو نہیں ہے ثبات
نہیں عمر دنیا کا کچھ اعتبار
ہے اصل بنا اس کا ناپائدار
کہ یک بار خاطر میں یہ آ گیا
کوئی ایسی تصنیف کیجے بھلا

---

[۱۶] اس مثنوی "ریاض سیر" کے مخطوطے "سالار جنگ میوزیم لائبریری، حیدرآباد اور کتب خانہ محمدی، دیوان صاحب باغ چنّئی (مدراس) کی زینت ہیں، "ریاض سیر" اس کی تصنیف ۱۲۴۷ھ /۱۸۳۱ء کے تیئس (۲۳) سال بعد، ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۳ء میں مطبع شرفیہ مدراس سے ہوئی، مگر اس کے مطبوعہ نسخے نایاب ہیں، البتہ ایک بوسیدہ کرم خوردہ نسخہ دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان ویلور میں محفوظ ہے، یہی گرانقدر نسخہ راقم کے زیر مطالعہ رہا ہے۔

کہ ہو فائدہ اس سے لوگوں کے تیں
کہ یہ بھی کم از خیر جاری نہیں
بملک سخن، خسروِ نامور
تخلص ہے ذوقیؔ جسے مشتہر
لکھا اس نے ہے پرشرف اک کتاب
کہ بحر سیر میں ہے دُر خوش آب
ہے نظم اس کا اعجاز سے پر تمام
بھی ہے "معجز مصطفی" اس کا نام
تو ہندی میں کر ترجمہ اس کے تیں
بشرطیکہ افہام سے ہو قریں
تأمّل کے دریا میں بس غوطہ مار
نکالے عجب گوہر آبدار
یہی وہ ہے تاریخ بس جاں فزا
زہے معجز خاتمِ انبیا[۱۷]

۱۲۴۷ھ

حضرت حسرتؔ نے "ریاض سیر" کے آغاز میں حمد و نعت کے جو اشعار کہے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

حمد:

خدایا سزاوار شاہی تجھے
تو صاحب ہے، سب خادماں ہیں ترے
دل و جاں ترے بندہ فرما مدام
دل و جاں سے ہیں ہم بھی تیرے تمام

نعت:

---

[۱۷] جنوب کے اصحاب کمال (جلد اول) ص ۳۴۲-۳۴۷

امام رُسل، رہبر انس و جاں
امان زمین و امین زماں
محمدؐ نبی شاہ ابرار ہے
کلید در گنج اسرار ہے[۱۸]

"ریاض سیر" کو انیس حصوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں سے پہلا حصہ (فصل) نور محمدیؐ کے بیان میں ہے۔ حضرت حسرتؔ نے اس حصے میں حضور اکرم ﷺ کا سراپا بڑے ہی معنی آفریں اور استعاراتی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

کیا حکم ارواح کو پس یہ رب
کہ دیکھیں وہ نور مقدس کو سب
سب اس وقت بے خود ہوئے شوق سے
لگے نور احمدؐ کے تیں دیکھنے[۱۹]

حضرت حسرتؔ نے "ریاض سیر" میں دکنی اور اردو کا ملا جلا اسلوب اختیار کیا، جس کے سبب آپ کے کلام میں بہت سلاست و روانی اور شگفتگی و خوبصورتی پائی جاتی ہے۔

حضرت محمود مہاجر حسرتؔ کے ہمعصر تیرھویں صدی کے ایک صاحب تصنیف بزرگ حضرت مولانا قاضی محمد صبغۃ اللہ معروف بہ قاضی بدرالدولہ (ولادت ۱۲۱۱ھ وفات ۱۲۸۰ھ) ابن علامہ محمد غوث شرف الملک نائطی (متوفی ۱۲۳۸ھ مصنف نثر المرجان فی رسم نظم القرآن) نے سیرت مصطفیٰؐ پر کرناٹک کے حکمران نواب اعظم جاہ منور خاں بہادر جنگ (متوفی ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء) کی فرمائش پر بزبان فارسی ایک گرانقدر کتاب تحریر کی تھی جس کا عنوان "نورالابصار فی سیر سیدؐ الابرار" رکھا تھا۔ جب یہ کتاب سنہ ۱۲۳۹ھ میں مکمل ہو کر نواب موصوف کے مطالعے میں آئی تو نواب صاحب نے قاضی بدرالدولہ سے درخواست کی کہ اس کتاب میں معجزات کا بیان بھی شامل ہو اور اس پوری کتاب کو ہندی (اردو) میں ترجمہ کیا جائے۔ مگر قاضی بدرالدولہ اپنی مصروفیات کے سبب ترجمہ کو روبعمل لا نہ سکے۔ اعظم جاہ کے فرزند نواب غلام غوث خاں (متوفی ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء)

---

[۱۸] ماخذ سابق، ص ۳۵۰-۳۵۱

[۱۹] ماخذ سابق، ص ۳۵۴

کے دور اقتدار میں قاضی صاحب نے ترجمہ بحسن وخوبی انجام دیا اور اس کا نام "فوائد بدریہ" رکھا۔ یہ سیرت رسول اکرم ﷺ پر مشتمل ضخیم نثری تالیف بتاریخ ۵/ رجب المرجب ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۵/ ستمبر ۱۸۳۹ء اختتام پذیر ہوئی۔ جنوبی ہند میں اس کی اشاعت مدراس اور حیدرآباد کے مطابع سے بار بار ہوتی رہی۔ حضرت قاضی بدرالدولہ کی یہ گرانقدر نثری تالیف سیر نگاری کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ (۲۰)

اس مقالے میں ابتک جن سیرت نگاروں کا ذکر ہوا ہے، ان سبھی نے سیرت النبیؐ پر مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن اردو کے بعض قدیم اہل قلم ایسے بھی ہیں جنہوں نے "قصص الانبیاء" کے عنوان سے ضخیم کتابیں تالیف کرتے ہوئے انبیائے سابقین علیہم السلام کے ذکر کے آخر میں خاتم الانبیاء، سرور کونین کا بھی مفصل تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح کسی نہ کسی طرح سیرت نگاروں میں ان کا نام بھی شامل ہو گیا۔ ان قلمکاروں میں دکنی زبان کے مشہور مصنف اور قادر الکلام شاعر غوثی آرکاٹی (متوفی ۱۲۲۵ھ) نے ایک طویل مثنوی بنام "ریاض مسعود" ترجمہ قصص الانبیاء (فارسی) سنہ ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء میں تحریر کی۔ یہ طویل وعظیم مثنوی ساڑھے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ (۲۱)

غوثی آرکاٹی کا پورا نام سید محمد غوث قادری معروف بہ غوث جامی ابن افصحی بیجاپوری (متوفی ۱۱۶۵ھ) ہے۔ آپ علامہ باقر آگاہ (متوفی ۱۲۲۰ھ) کے نہ صرف معاصر و محب تھے بلکہ آپ نے علامہ آگاہ کی کتابوں پر تاریخی قطعات رقم کئے۔ حضرت غوثی آرکاٹی درویش صفت، مرنجاں مرنج طبیعت اور پابند شریعت شخص تھے، طریقت میں قادری المسلک ہونے کے علاوہ سنی المشرب تھے۔ (۲۲)

"ریاض مسعود" کے مخطوطے کتب خانہ سالار جنگ میوزیم، ادارہ ادبیات اردو، اورینٹل میونسکرپٹ لائبریری حیدرآباد، انجمن ترقی اردو دہلی اور انجمن ترقی اردو کراچی کی زینت ہیں۔ (۲۳)

---

(۲۰) محمد یوسف کوکن عمری، خانوادۂ قاضی بدرالدولہ (جلد اول)، دارالمصنّفین، مدراس، ۱۳۸۲/ ۱۹۶۳

(۲۱) محمد علی اثر، بصارت سے بصیرت تک، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء ص ۹۳

(۲۲) ماخذ سابق، ص ۸۷

(۲۳) ماخذ سابق، ص ۹۴

غوثی جامی آرکاٹی کے بعد جس اہم ترین علمی شخصیت کی تصنیف کو برصغیر ہندوپاک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہ ہیں نواب عبدالصمد دلیر جنگ بہادر (متوفی ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء) ابن نواب عبدالوہاب نصیر الدولہ بہادر (متوفی ۱۲۱۸ھ /۱۸۰۳ء)۔ نواب عبدالوہاب حاکم صوبہ کرناٹک نواب محمد علی والاجاہ (متوفی ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء) کے حقیقی بھائی تھے۔ نواب دلیر جنگ کا یادگار کام یہ ہے کہ آپ نے ''روضۃ الاصفیاء'' ترجمۂ قصص الانبیاء (فارسی) کے عنوان سے تین سو انیس صفحات پر مشتمل کتاب تصنیف کی، جس میں ان پیغمبروں کے حالات بھی شامل کئے جن کا ذکر اصل فارسی متن میں نہیں تھا۔ اس طرح نواب موصوف نے ترجمے کی کاوشوں کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔ اس مؤقر تصنیف میں رسولوں اور نبیوں کے تذکرے کے ہمدوش حضور پرنورؐ کی سیرت طیبہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے سالار جنگ میوزیم حیدرآباد اور کتب خانۂ انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود ہیں۔[۲۴]

مذکورہ بالا دونوں کتابیں –''ریاض مسعود'' اور ''روضۃ الاصفیاء'' – فارسی ''قصص الانبیاء'' کے ترجمے ہیں۔ اس بات کا ذکر مترجمین نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ مگر ان قابل مؤلفین نے فارسی ماخذوں کی اطلاع نہیں دی۔ اس عقدے کو حل کرنے کے لئے راقم السطور نے فارسی ادبیات کے مشہور محقق وادیب ڈاکٹر عارف نوشاہی سے استفسار کیا کہ اس دور کی کون سی مشہور کتابیں تھیں جو اردو قصص الانبیاء کے لئے ماخذ بنی ہوں۔ بقول ڈاکٹر عارف نوشاہی: ''اس زمانے میں ''قصص انبیاء'' کے طور پر فارسی زبان کی دو کتابیں مشہور و متداول تھیں۔ ان میں سے ایک قصص الانبیاء/ تاریخ خلاصۃ الانبیاء از محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن آذر بخاری اور دوسری کتاب ''عجائب القصص/قصص الانبیاء'' از عبدالواحد محمد مفتی (متوفی قبل ۸۹۹ھ) ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا مشکل ہے کہ ''ریاض مسعود اور روضۃ الاصفیاء'' کے مصنّفین نے کس فارسی مأخذ سے استفادہ کیا تھا۔

سطور بالا میں جن دو قلمکاروں کا تذکرہ گزر چکا ہے، انہوں نے ''قصص الانبیاء'' (فارسی) کو اردو کا جامہ پہنایا تھا، مگر عہد عادل شاہی (۸۹۶ھ تا ۱۰۹۸ھ / ۱۴۹۰ء تا ۱۶۸۶ء) کے آخری دور

[۲۴] راہی فدائی ''تذکرہ محدثین جنوب اور دیگر مضامین'' الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۲۰ء، ص ۸۸

میں ایک ایسا مثنوی گو بھی گزرا ہے جس نے "قصص الانبیاء" کو کسی کتاب سے ترجمہ کئے بغیر خود سے لکھا تھا۔ بقول ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ (متوفی ۱۹۶۲ء):

> قدرتی اس دور کا ایک مثنوی گو تھا۔ اس نے ایک طویل مثنوی "قصص الانبیاء" لکھی تھی جس میں دس ہزار بیتیں ہیں۔ یہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں، خود قدرتی نے یہ قصے مختلف کتابوں اور تفسیروں سے اخذ کر کے لکھے ہیں۔ (۲۵)

بہر حال مذکور بالا کتابیں وہ ہیں جن میں سیرت پاک کا موضوع جزوی طور پر شامل کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں جنوبی ہند اور دکن میں میلادنامے، وفات نامے اور ضیافت نامے لکھے گئے ہیں جن میں سیرت نبویؐ کی جھلکیاں خرد کی آنکھوں کو خیرہ کرتی نظر آتی ہیں۔ مثلاً سید افصحی (متوفی ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء) کا "وفات نامہ نبیؐ"، غوثی جامی آرکاٹی (متوفی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) کا "ضیافت نامۂ محمد مصطفیٰ"، شیخ الاسلام فضیلت جنگ شاہ انوار اللہ فاروقیؒ بانی جامعہ نظامیہ حیدرآباد دکن (متوفی ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۶ء) کا میلاد نامہ بعنوان "انوار محمدی"۔ حضرت فضیلت جنگ کی یہ مثنوی قیام مکہ مکرمہ کے دوران تحریر کی گئی۔ اس میں آپ کے شیخ و مرشد قدوۃ السالکین حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (متوفی ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء) کی تقریظ موجود ہے۔ (۲۶) مزید یہ کہ شہنشاہِ رباعیات حضرت سید احمد حسین امجدؔ حیدرآباد (متوفی ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۱ء) نے "نذر امجد" بحضور رحمت عالمؐ کے عنوان سے سنہ ۱۳۵۵ھ میں "میلادنامہ" مسدس کی شکل میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ رسالہ بہت مقبول و معروف ہوا۔ علاوہ ازیں محدث دکن علامہ سید عبداللہ شاہ صاحب نقشبندی مجددی (متوفی ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ء) کا "میلاد نامہ" اور "معراج نامہ" بھی سیرت پاک کا روشن پہلو لئے ہوئے ہے۔ علاوہ ازیں جنوب کے مایہ ناز مصنف و محقق علّامہ شاہ محمد فصیح الدین نظامی نے شیخ الاسلام حضرت انوار اللہ فاروقی چشتی علیہ الرحمہ کی تصانیف سے مضامین سیرت کو یکجا کر کے "انوار الکلام فی سیرت خیر الانام" کے عنوان سے ۲۰۲۶ء میں شائع کیا ہے۔

جنوبی ہند میں سیرت نگاری کا نورانی تسلسل اردو زبان و ادب کی نسبت سے ہر دور میں جاری رہا ہے۔ چار صدیوں پیشتر سیرت نگاری کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

---

(۲۵) محی الدین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ، ۱۹۹۳ء، ص ۵۰

(۲۶) اس بات کی اطلاع مولانا شاہ محمد فصیح الدین نظامی نے راقم کو دی ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے ایک عظیم عالم و فاضل اور باکمال مصنف کے کارنامے کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ایک صدی پیشتر شیخ الملۃ علامہ ضیاء الدین احمد امانی ہاشمی باقویؒ (۱۳۱۱ھ-۱۳۸۶ھ مطابق ۱۸۹۳-۱۹۶۶ء) نے حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر منظوم کتاب بنام "گلشن سیرت" تحریر کی، جس میں انہوں نے سیرت پاکؐ کے تمام پہلوؤں پر زبان و بیان کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھتے ہوئے بہت عمدگی سے روشنی ڈالی۔ (۲۷)

علامہ امانی ہاشمی کے ہمعصر مولانا نصیر الدین ہاشمی (۱۸۹۵ء-۱۹۶۴ء) بلند پایہ مصنف و محقق تھے۔ آپ نے سیرت پاک پر تحریر کردہ اپنے چند مضامین جمع کر کے ۱۱۶ صفحات کا ایک مختصر رسالہ "ذکر نبیؐ" کے نام سے سنہ ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں شائع کیا، جو ان دنوں کافی مقبول ہوا۔ (۲۸)

علامہ امانی کے شاگرد رشید علامہ نثار احمد ویلوری معروف بہ فدوی باقوی (۱۹۲۸ء-۱۹۹۳ء) مصنف مجدد جنوب (سوانح بانیٔ باقیات صالحات) وسیار گان جنوب، ایک بلند پایہ ادیب، جلیل القدر شاعر اور مایہ ناز نقاد تھے، فن شاعری اور علم عروض میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ علامہ فدوی باقوی کا بیش بہا ادبی کارنامہ "رباعیات سیرت" ہے جس میں آپ نے حضور پر نور ﷺ کی حیات طیبہ کو رباعیات کے توسط سے بیان کیا ہے۔ "رباعیات سیرت" میں تقریباً تین سو رباعیاں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں سے چند رباعیات بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

اصناف سخن میں ہے رباعی مشکل
سیرت کا بیاں پھر انتہائی مشکل
یا رب تو کشائندۂ ہر مشکل ہے
تھی ورنہ مجھے تو لب کشائی مشکل

وہ مہر کہ مہر جس سے ضو پاتا ہے
وہ ماہ کہ ماہ جس سے شرماتا ہے
دنیا میں ہے جس سے نور مطلق کی نمود
دنیا میں وہ نور جلوہ فرماتا ہے

---

(۲۷) راہی فدائی، مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کے علمی و ادبی کارنامے، ابنائے باقیات، ویلور ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۶ء، ص ۹۳

(۲۸) حسام الدین سید، حیدرآباد میں کتب سیرۃ النبیؐ کا اجمالی جائزہ، ایس کے پرنٹرس،، حیدرآباد، ۲۰۱۹ء، ص ۱۰

طائف پہ شہہؐ ہدیٰ کا ہوتا ہے نزول
توحید کا پہنچاتے ہیں پیغام رسول
اخوان شیاطیں کے دلوں سے نہ گئے
ایمان کے، عرفان کے انوار قبول[۲۹]

جنوبی ہند میں سیرت نگاری کے منظر نامے میں مزید چند نئے قلمکاروں نے اہل نظر کو دعوت نظارہ دیا ہے۔ ان مبارک ہستیوں میں ایک نام جسٹس ابوالفضل سید محمود قادری حیدرآبادی (۱۹۱۱ء-۲۰۰۰ء) کا ہے، جنہوں نے حضرت سید شاہ غلام علی قادری (متوفی ۱۲۵۸ھ) کی سیرت پاکؐ پر مبنی فارسی تصنیف "مشکوٰۃ النبوہ" کا ترجمہ کرکے اپنا نام زندۂ جاوید بنالیا۔ یہ مستند کتاب ۱۹۸۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ حیدرآباد کے سیرت نگاروں میں ایک اور فاضل صاحب قرطاس و قلم مولانا ڈاکٹر محمد غوث ندوی ہیں جو دارالعلوم الاسلامیہ کیلیفورنیا (امریکہ) کے بانی وصدر ہیں، آپ نے "سیرت شہنشاہ کونینؐ" کے نام سے دوسو ستتّر صفحات پر مشتمل کتاب رقم کی جو حیدرآباد سے ۱۹۹۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اسی طرح ڈاکٹر سید محی الدین قادری ہادی (متوفی ۲۰۰۴ء) نے "خیر البشر رسول اللہؐ" تصنیف کی۔ ۲۶۴ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ گرانقدر کتاب سنہ ۱۹۹۷ء میں حیدرآباد سے منظر عام پر آئی۔ دکن کے سیرت نگاروں میں سید نصیر الدین احمد قابل قدر مصنف، بلند پایہ محقق و مؤرخ کی حیثیت سے معروف ہیں، آپ نے "مرقع سیرتِ طیبہ" رقم کرکے اہل علم و اصحاب ذوق سے داد و تحسین حاصل کی۔ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل یہ مرقع سنہ ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔[۳۰]

علاوہ ازیں سرزمین دکن کے ایک مایہ ناز مصنف مولانا ڈاکٹر مفتی سید ضیاء الدین نقشبندی مجددی قادری نے بعنوان "سیرت النبیا" ایک مفصل اور مستند و مدلل کتاب تصنیف کی ہے۔ آپ جامعہ نظامیہ حیدرآباد (دکن) کے صدر مفتی اور نائب شیخ الجامعہ ہیں اور ابوالحسنات ریسرچ سنٹر، حیدرآباد کے بانی و مؤسس بھی ہیں۔ آپ کی یہ معرکۃ الآرا کتاب سیرت پاکؐ کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام پہلوؤں کو اسباق کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس

---

[۲۹] نصیر الدین ہاشمی، ذکر نبیؐ اعظم، اسٹیم پریس، چارمینار، حیدرآباد، ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء

[۳۰] مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کے علمی و ادبی کارنامے، ص ۱۴۳-۱۴۴

کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی اولین طباعت ۲۰۰۷ء میں ہوئی تھی۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ "The Life of Prophet Mohammad" کے نام سے سنہ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔

جنوبی ہند کا تاریخی علاقہ بھٹکل صدیوں سے علم و آگہی کا معدن و مخزن رہا ہے۔ بھٹکل میں حکمت و عرفان کا سلسلہ تاحال جاری و ساری ہے۔ موجود دور میں اس سرزمیں سے اٹھنے والا باکمال مصنف و محقق و سیرت نگار مولانا فیصل احمد ندوی بھٹکلی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو، کی تحقیقی کاوش بنام "محمد نبی الرحمۃ" عربی زبان میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کو رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم ادارہ "الھئیۃ العالمیۃ للتعریف بالرسول ونصرتہ" نے مقابلۂ سیرت ۲۰۰۷ میں انعام اول سے نوازا تھا۔ اس گرانقدر کتاب کو سنہ ۲۰۲۵ء میں بھٹکل کے ممتاز قلمکار مولانا سمعان خلیفہ ندوی نے اردو کے خوبصورت پیراہن سے مزین کیا اور اس کا نام "رسول رحمتؐ" رکھا۔[۳۱]

خاک بھٹکل سے نکلا ہوا ایک اور یاقوت پورے ہندوستان کو اپنی علمی و انتظامی صلاحیتوں سے منور و درخشاں کر رہا ہے۔ وہ قیمتی ہیرا مولانا الیاس ندوی کے نام سے علمی دنیا میں متعارف ہے۔ مولانا الیاس نامور مصنف اور بلند پایہ محقق ہیں۔ مولانا الیاس نے علمی، دینی اور تاریخی موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں حضور اکرم اکی سیرت پاکؐ کے موضوع پر رقم کردہ دو کتابیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی "لمحات نبویؐ" ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔[۳۲] اب تک اس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ معرکہ آرا کتاب انگریزی اور ہندی سمیت کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول و مشہور ہوئی۔ دوسری گرانقدر کتاب "مجالس نبویؐ" ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے جملہ صفحات ۲۷۲ ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا الیاس ندوی نے سیرت طیبہ کے موضوع ہی پر بچوں کے لئے بھی ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام "پیارے بچوں کے پیارے رسول" ہے، یہ مؤقر کتاب ۲۰۲۶ء میں منظر عام پر جلوہ گر ہوئی۔[۳۳]

علامہ فدوی باقوی کے شاگرد راقم راہی فدائی نے نصف صدی سے زائد عرصہ لکھنے پڑھنے میں گذارا۔ نتیجتاً پچاس سے زائد کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں۔ راہی کی تصنیفات میں سب

---

(۳۱) حسام الدین سید "حیدرآباد میں کتب سیرت النبیؐ کا اجمالی جائزہ"، ۲۰۱۹ء، سے استفادہ کیا گیا۔

(۳۲) فیصل احمد بھٹکلی ندوی، رسول رحمت، مترجم محمد سمعان خلیفہ ندوی، ادارۂ احیائے علم و دعوت، لکھنو، ۲۰۲۵ء ص ۱۱-۱۲

(۳۳) الیاس احمد بھٹکلی، لمحات نبوی، مکتبہ الحسنات، دہلی، ۲۰۰۱ء

سے زیادہ مسعود تصنیف ”سرور کائناتؐ کی سیرت و سوانح پر تحریر کردہ کتاب ”یا صاحب الجمال“ ہے۔ یہ منظوم تخلیق اردو میں سیرت پر تحریر کردہ کتابوں میں شاید مختصر ترین ہے۔ اس کے اوراق صرف چالیس (۴۰) ہیں اور یہ بارہ ابواب میں منقسم ہے۔[۳۴]

تازہ اطلاع کے مطابق جنوب کے مشہور شاعر و ادیب جناب سراج زیبائی نے منظوم سیرت ”درود پڑھتی ہیں میری سانسیں“ کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب ۱۴۳ صفحات کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

جنوبی ہند میں سیرت نگاری کا سفر بڑوں کے لئے ہی نہیں بلکہ بچوں کے لئے بھی دلچسپی کے ساتھ جاری ہے۔ بچوں کے اس کارواں کے امیر مولانا حافظ عبدالرزاق باقوی معروف بہ حافظ باقوی (متوفی ۲۰۰۵ء) علامہ فدوی باقوی کے شاگرد رشید ہیں۔ حافظ باقوی نے بچوں کے لئے نئی کلیاں، ننھے پھول، چاند تارے، پھلواری وغیرہ کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کی وجہ سے آپ کا لقب ”شاعر اطفال“ پڑ گیا۔ آپ کی تمام تصنیفات میں معرکہ آرا کتاب بچوں کے لئے تحریر کردہ منظوم سیرت طیبہ بنام ”قمر نامۂ اسلام“ ہے جو ۱۹۹۰ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔[۳۵]

مولانا حافظ باقوی کی طرح موجود دور میں ماہر ادب اطفال کے طور پر جناب ڈاکٹر امجد حسین حافظ کرناٹکی ہیں۔ حافظ کرناٹکی نے اطفال کے لئے سیرت النبیؐ پر ضخیم کتاب ”ہمارے نبیؐ“ سنہ ۲۰۰۷ء میں تحریر کی تھی۔ یہ متبرک کتاب ادبی حلقوں میں بالخصوص بچوں کے تعلیمی اور تربیتی اداروں میں مقبول ہوئی۔[۳۶] حاصل کلام یہ کہ علاقۂ جنوبی ہند میں سیرت نگاری کی جو روایت صدیوں پیشتر شروع ہوئی تھی، وہ تاحال جاری و ساری ہے۔[۳۷]

---

[۳۴] ”پیارے بچوں کے پیارے رسول، مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی، بھٹکل

[۳۵] راہی فدائی، یا صاحب الجمالؐ، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۰۶ء

[۳۶] حافظ باقوی، قمر نامۂ اسلام، حافظ پبلی کیشنز، میل وشارم، ۱۹۹۰ء

[۳۷] حافظ کرناٹکی ڈاکٹر امجد حسین، ہمارے نبیؐ، فرید بک ڈپو، نئی دہلی

اس مقالے کی تیاری میں جن احباب کا تعاون رہا ہے، وہ یہ ہیں: ڈاکٹر عارف نوشاہی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر اجمل اصلاحی، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، ڈاکٹر بشیر الحق، قاری امتیاز رشادی، قاضی اسد ثنائی، مولانا فصیح الدین نظامی، مولانا فیصل بھٹکلی ندوی اور مولانا الیاس ندوی اور راقم کے فرزند سفیان احمد۔ راقم کی پوتیاں بنفشہ زہرا، فبھاز ہرا کتابیں تلاش کر کے نکالنے میں مدد دیتی ہیں کیونکہ راقم جھکنے سے معذور ہے۔ راقم ان سب احباب کا بصمیم قلب شکر گذار ہے۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء۔

حضرت علی بن ابی طالب کرّم اللہ وجہہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الشریف جامع کمالات تھے۔ وہ نوجوانوں اور مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت کے مطابق حضور پاکؐ کی بعثت پیر کے روز ہوئی اور حضرت علی صرف ایک دن بعد یعنی منگل کو ایمان لائے۔ اس وقت آپ کی عمر مشکل سے آٹھ یا دس سال تھی۔ حضرت علیؓ کو دنیا میں فرد واحد ہونے کا شرف حاصل ہے جن کی پیدائش خانہ کعبہ کے اندر ہوئی۔ اسی وجہ سے ان کو "مولود کعبہ" بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ حضور پاک ﷺ اور سیدہ خدیجہؓ کے ساتھ نماز پڑھنے والے اول شخص تھے۔

چونکہ حضور پاکؐ کے چچا حضرت ابو طالب کثیر العیال تھے، اس لئے حضور پاک ﷺ نے حضرت علیؓ کو گود لے لیا تھا اور آپؐ ہی کے سایۂ عاطفت میں حضرت علی کی پرورش ہوئی۔ جب حضور پاکؐ مدینہ جانے پر مجبور ہوئے تو آپؐ کی چارپائی پر حضرت علی ہی سوئے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور پاک نے ہجرت کے قبل اسوقت مکہ میں موجود صحابہ کرام سے پوچھا کہ میرے بستر پر کون سوئے گا تو کسی نے جواب نہیں دیا ماسوا حضرت علی کے جنہوں نے تین بار کہا کہ "میں سوؤں گا"۔ قریش حضور پاک کو قتل کرنے کا قطعی منصوبہ بنا چکے تھے۔ ایسے حالات میں حضرت علی کا یہ فیصلہ ان کی حضور پاکؐ سے انتہائی محبت اور ان کے لئے جان دینے کے لئے تیار رہنے کی دلیل تھا۔

حضرت علی نے حضور پاک کی ہجرت کے صرف تین دن بعد مدینہ ہجرت کی۔ آپؓ کے ساتھ ہجرت میں خاندان قریش کی تین "فاطمائیں" بھی شریک تھیں: فاطمہ بنت اسد، فاطمہ بنت محمدؐ اور فاطمہ بنت الزبیر۔ اسی لئے اسے "فاطماؤں کا قافلہ" (رکب الفواطم) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ رات کو چلتے اور دن میں کہیں چھپ جاتے۔ یوں حضرت علی مدینہ کے پاس کی بستی قباء پہنچے جہاں حضور پاک ﷺ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اس سفر میں حضرت علی، جن کی عمر اس وقت ۲۲

سال تھی، کے پیر سوج گئے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ حضور پاک ﷺ ان کو اپنے گھر لے گئے۔ انصار و مہاجرین کی مواخات کے برعکس حضور پاک نے حضرت علی کو اپنا بھائی بنایا، یعنی دونوں بھائی مہاجر تھے۔ حضور پاک نے اس موقعے پر حضرت علی سے کہا: "انت أخی فی الدنیا والآخرۃ" (تم دنیا اور آخرت دونوں میں میرے بھائی ہو)۔

اگلے سال حضور پاکؐ نے حضرت علی کو اپنا داماد بھی بنالیا۔ یوں وہ سیدۃ نساء أہل الجنۃ (جنت کی خواتین کی سردار) کے شوہر بھی ہوئے اور سیدا شباب اہل الجنۃ (جنت کے نوجوانوں کے سردار) حضرت حسن و حضرت حسین کے والد ماجد بھی ہوئے۔ خیبر جب فتح نہیں ہو پا رہا تھا تو حضرت علی نے ہی اسے فتح کیا اور "اسد اللہ" (شیر خدا) کے لقب سے موسوم ہوئے۔ وہ تمام غزوات میں شریک رہے ماسوائے غزوۂ تبوک کے، جس کے دوران آپ کو مدینہ میں حضور پاک ﷺ نے نائب کی حیثیت سے متعین کیا تھا۔

غزوۂ بدر میں پہلے نکلنے والے تین کافر سورماؤں میں سے ایک کو آپ نے واصل جہنم کیا۔ غزوۂ خندق میں عرب کے مشہور پہلوان عمرو بن عبد وُدّ نے جب خندق پار کر کے مسلمانوں کو للکارا: "ہل من مبارز؟" (ہے کوئی مجھ سے لڑنے والا؟) تو حضرت علی نے ہی اس کا چیلنج قبول کیا اور اس کی گردن اڑائی۔ غزوۂ خیبر میں یہودی پہلوان مرحّب کا سر بھی آپ نے ہی قلم کیا۔ فتح مکہ کے بعد حضور پاک نے خانۂ کعبہ کے اندر اور باہر بتوں کے بڑے بڑے اڈوں کو توڑنے کا کام بھی حضرت علی کے سپرد کیا۔

حدیث مباہلہ اور حدیث کساء میں آیا ہے کہ حضور پاکؐ نے فرمایا کہ علی، فاطمہ، حسن اور حسین ان کے "اہل بیت" یعنی خاندان والے ہیں۔ ۱۸ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو حجۃ الوداع کے بعد مدینہ واپس آتے ہوئے حضور پاکؐ غدیر خم (خم کا کنواں) کے پاس رکے اور وہاں فرمایا: "من کنت مولاہ فعلیٌ مولاہ" (میں جس کا مولی (دوست) ہوں، علی بھی اس کے مولی (دوست) ہیں)۔ اس حدیث پاک سے کسی کو انکار نہیں۔ شیعہ بھائی اس حدیث کو حضرت علی کے امام و خلیفہ ہونے کا اعلان سمجھتے ہیں جبکہ اہل سنت اس کو حضرت علی کی عظمت اور حضور پاک ﷺ سے انتہائی قربت کا اعلان سمجھتے ہیں۔

حضور پاکؐ نے فرمایا: "انا مدینۃ الحکمۃ وعلیّ بابہا" (میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کے

دروازے ہیں)۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضور پاک ﷺ نے "أفقہ الناس" اور "أقضی الناس" کہا تھا یعنی دین کو سب سے زیادہ سمجھنے والا اور سب سے زیادہ عدل و انصاف کرنے والا۔ حضور پاک نے یہ بھی فرمایا کہ "علی سے کوئی منافق محبت نہیں کر سکتا اور ان سے کوئی مؤمن بغض نہیں کر سکتا"۔ حضرت سعید الخدریؓ کا کہنا ہے کہ "ہم انصار لوگ منافقین کو حضرت علی سے ان کی نفرت کی وجہ سے پہچان لیا کرتے تھے"۔ آپ کرم اللہ وجہہ کے بارے میں حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "اے علی! تیری وجہ سے دو گروہ جہنم میں جائیں گے۔ ایک تیرے ساتھ محبت میں غلو کرنے والا اور دوسرا تیرے ساتھ دشمنی میں غلو کرنے والا"۔

جب خارجیوں نے آپ کا نام بگاڑنا چاہا تو مسلمانوں نے حضرت علی کو "کرّم اللہ وجہہ" (اللہ آپ کے چہرے کو باعزت کریں) کے لقب سے پکارنا شروع کر دیا جو کہ صحابہ کرام میں سے صرف حضرت علی کے لئے مخصوص ہے۔ "کرّم اللہ وجہہ" کے لقب کی ایک توجیہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ حضرت علی نے کبھی کسی بت کی پوجا نہیں کی۔ انہیں خارجیوں میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علی کو ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۴۰ھ میں زہریلی تلوار سے حملہ کر کے شہید کر دیا۔ آپ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے اور چوتھے روز ۲۱ رمضان المبارک کو وفات پائی۔

آپ کرّم اللہ وجہہ صحابہ کرام میں سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے فقیہ اور سب سے فصیح شخص تھے۔ اس بات کی گواہی نہج البلاغۃ کا ایک ایک جملہ دیتا ہے۔ سوائے سلسلۂ نقشبندیہ کے، باقی تمام صوفی مذاہب حضرت علی پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تقریباً تمام صوفی طریقے آپ سے ہی شروع ہوتے ہیں۔

حضرت علی نے ساری زندگی عیش و عشرت پر فقر و فاقہ کو ترجیح دی حالانکہ اسلام میں داخل ہونے والوں میں سابقین و اولین کی حیثیت رکھنے کی وجہ سے آپ کو بیت المال سے حضور پاک کے چچا حضرت عباس کے بعد سب سے زیادہ وظیفے کی رقم ملتی تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ بعض سالوں میں آپ نے صرف زکوٰۃ میں ۴۰ ہزار دینار خرچ کئے۔ اللہ پاک کے حکم کہ "قل العفو" (البقرہ:۲۱۹)، یعنی جو تمہاری ضرورت سے بچ جائے اسے خرچ کرو، کی تعمیل میں آپ جلد از جلد اپنی دولت خیرات و صدقات میں خرچ کر دیتے۔

حضور پاک کے انتقال کے بعد خلافت کے لئے سب سے مناسب اور سب سے زیادہ حقدار

حضرت علی ہی تھے۔ اگر وہ اس وقت خلیفہ بن گئے ہوتے تو امت کو حضور پاک کے بعد ۳۰ سال متواتر ایک بہترین حاکم نصیب ہوا ہوتا جس کی وجہ سے وہ بہت سا خلفشار پیدا نہ ہوتا جس کی ابتدا حضرت عثمان کے زمانے سے شروع ہوئی اور جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حضرت علی خلیفۂ اول ہو گئے ہوتے تو شیعہ سنی مسئلہ بھی پیدا نہیں ہوتا جس کی وجہ سے عالم اسلام میں صدیوں خلفشار رہا ہے اور آج بھی ہے۔

بہر حال تاریخ کے واقعات بہت سے عوامل کی وجہ وقوع پذیر ہوتے ہیں جن کے بارے میں آج ہم تبصرہ ہی کر سکتے ہیں، بدل نہیں سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت علی کے حق خلافت کو نظر انداز کیا گیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے سے پہلے تینوں خلفاء کے ساتھ عمدہ سلوک روا رکھا اور سب کے معین و مشیر رہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں آپ اموال خمس کی تقسیم کے متولی تھے اور مرتدین کی سرکوبی کے لئے بھیجی جانے والی فوج کے قائد بھی۔ اسی طرح حضرت عمر الفاروقؓ کے عہد خلافت میں بھی حضرت علی نے حکومت وقت کے ساتھ پورا تعاون کیا بلکہ قاضئ مدینہ کا عہدہ بھی سنبھالا جو آج چیف جسٹس کے برابر ہے۔ حضرت عثمان ذی النورینؓ کے زمانے میں بھی آپ کا تعاون برقرار رہا یہاں تک کہ سنہ ۳۵ھ میں آپ چوتھے خلیفہ بنے اور اگلے پانچ سال تین ماہ تک خلیفہ رہے۔

خلافت قبول کرنے کے تیسرے ہی روز حضرت علی نے سبائی ساز شی ٹولہ کو مدینہ سے نکلنے کا حکم دیا، جس کی وجہ سے وہ حضرت علی کی جان کے دشمن ہو گئے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے خلاف حضرت علی کو لڑائیاں لڑنی پڑیں حالانکہ اگر انھیں امن و سکون میسر ہوا ہوتا تو عالم اسلام کا رقبہ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو جاتا۔ یہی سبائی ٹولہ بعد میں نواصب یا خوارج کے نام سے معروف ہوا اور آج کے القاعدۃ اور الدولۃ الاسلامیہ (ISIS یا داعش) کے دہشت گرد انہیں کی ناجائز اولاد ہیں جنہوں نے اسلام، مسلمانوں اور عالم اسلام کو بدنام اور تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

حضور پاکؐ کے انتقال کے بعد پہلے سعد بن عبادۃ انصاریؓ نے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا لیکن اکثر صحابہ کا اتفاق رائے حضرت ابو بکرؓ پر ہوا۔ حضرت علی اور ان کے کچھ مؤید صحابہ کا خیال تھا کہ حضرت علی خلافت کے لئے موزوں ترین شخص ہیں لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو اسلام کی تاریخ بہت مختلف ہوتی کیونکہ حضرت علی کو مسلسل تیس سال حکومت کرنے

کا موقعہ ملتا اور شیعہ سنی کا مسئلہ بھی نہیں پیدا ہوتا حالانکہ شیعہ اور سنی دونوں حضرت علی کو مانتے ہیں اور ان کی عظمت واولیت و اسبقیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

بہر حال اہل سنت کی روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت علی نے اس صورت حال کو قبول کیا۔ ممتاز شیعہ عالم محمد حسین کاشف الغطاء (م:۱۹۵۴) نے اپنی کتاب "أصل الشيعة و أصولها" میں لکھا ہے کہ حضرت علی نے اپنے سے پہلے تینوں خلفاء سے بیعت کی، ان کے ساتھ ہاتھ بٹایا اور ان کے مشیر کے طور سے کام کرتے رہے۔ ابن الاثیر کی کتاب "الكامل فی التاریخ" میں ذکر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں حضرت علی مدینہ منورہ کے قاضی یعنی آج کے لحاظ سے چیف جسٹس تھے۔ یہ سلسلہ حضرت عمر کی خلافت کے دوران بھی جاری رہا۔ حضرت علی نے حضرت ابو بکر کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ حضرت اسماء بنت عمیس سے شادی کی اور حضرت ابو بکر کے بیٹے محمد بن ابی بکر کی کفالت بھی کی جو حضرت علی کے بہت بڑے مؤید و مدد گار بنے اور حضرت علی نے ان کو مصر کا گورنر بنایا۔

جب حضرت عمر بیت المقدس کو فتح کرنے کے لئے گئے تو حضرت علی کو مدینہ کا گورنر بنا کر گئے۔ حضرت عمرؓ امور سلطنت کے معاملات میں حضرت علیؓ سے مشورے کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں حضرت عمرؓ کا ایک قول مروی ہے: " لولا علی لهلک عمر "(اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا)۔ حضرت عمرؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں حضرت علی سے کہا: "أعوذ بالله أن أعيش فی قوم لست فيهم يا أبا الحسن" (اے حسن کے والد! میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں ایسے لوگوں میں زندگی گزاروں جن میں آپ نہ ہوں)۔

ابن الاثیر کی الکامل فی التاریخ اور انھیں کی دوسری معروف کتاب اُسدُ الغابۃ میں آیا ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی کی بیٹی ام کلثوم سے شادی کی۔ حضرت عمر نے فدک اور خیبر کے باغات بھی حضرت علی، حضرت عباس اور بنی ہاشم کو واپس کر دئے۔ اپنے انتقال کے وقت حضرت عمر نے اپنے بعد جن چھ لوگوں کا نام لیا کہ ان میں سے ایک کو اگلا خلیفہ بنایا جائے، ان میں حضرت علی کا نام بھی شامل تھا، لیکن حضرت علی نے حکم (ثالث) عبد الرحمٰن بن عوفؓ کی یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ یہ عہد کریں کہ "اللہ، اس کے رسول اور ابو بکر و عمر کی اتباع کریں گے"، جبکہ حضرت عثمان نے یہ بات مان لی اور ان کو خلیفہ بنا دیا گیا۔ بعد میں کچھ تردد کے بعد حضرت علی نے

حضرت عثمان سے بیعت کرلی لیکن جلد ہی ان کے خدشات صحیح ثابت ہوئے اور حضرت عثمان کے زمانے میں بنو امیہ کا حکومت کے معاملات میں عمل دخل بہت بڑھ گیا جس کی وجہ سے پہلی دفعہ اسلامی سلطنت میں خلفشار پیدا ہوا اور باغی کوفہ، بصرہ اور مصر سے حضرت عثمان کو معزول کرنے کے لئے مدینہ پہنچ گئے۔ اس درمیان حضرت علی نے حَکَم یعنی ثالث کا رول ادا کیا۔ لیکن حالات بگڑتے چلے گئے، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، اور بالآخر باغیوں نے چالیس دن کے محاصرے کے بعد حضرت عثمان کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کر دیا۔ روایتوں کے مطابق حضرت علی کو حضرت عثمان کی شہادت سے بہت دکھ ہوا اور انہوں نے اپنے بیٹوں اور دوسرے ہمنوا صحابہ سے باز پرس کی کہ وہ حضرت عثمان کو کیوں نہیں بچا سکے۔

حضرت عثمان کی شہادت کے اگلے دن مدینہ میں حضرت علی کا انتخاب بطور چوتھے خلیفہ کے ہوا۔ لیکن یہ ایک ایسے وقت میں ہوا جب سلطنت کے بعض حصے (مثلاً مصر جس کے گورنر عمرو بن العاصؓ اور شام جس کے گورنر معاویہ بن ابی سفیان تھے) مدینہ کی اطاعت سے نکل چکے تھے اور عملاً باغی اور خود مختار ہو چکے تھے۔ حضرت علی نے مختلف علاقوں کے گورنر بدلنے شروع کئے لیکن مصر اور شام میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اور جلد ہی چند ماہ میں جنگ جمل سنہ ۳۶ ہجری میں ہوئی جس میں حضرت علی کے مخالفین حضرت عثمان کے قاتلوں کے قصاص کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ ایسے وقت میں ہوا جب حضرت علی شام کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ جنگ جمل میں مخالفین کو شکست فاش ہوئی، اس کے قائدین طلحہ اور الزبیر قتل ہوئے اور حضرت عائشہ کو مدینہ واپس جانا پڑا۔ اس غلطی پر حضرت عائشہ کو اتنی ندامت ہوئی کہ انھوں نے وصیت کی کہ مرنے کے بعد ان کو حضور پاک کی قبر مبارک کے پاس دفن نہ کیا جائے۔

حضرت علی حضرت عثمان کے قاتلوں سے بدلہ لینا چاہتے تھے لیکن اندرونی حالات اتنے خراب تھے کہ فوری طور سے کارروائی کرنے کا مطلب خانہ جنگی تھا۔ جنگ جمل کے بعد حضرت علی نے دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا کیونکہ وہاں ان کے بہت سے مؤیدین تھے اور وہ جگہ اس وقت کی سلطنت اسلامیہ کے وسط میں واقع تھی۔

شام میں حضرت عثمانؓ کے بنائے ہوئے گورنر معاویہ بن ابی سفیان نے حضرت علی سے بیعت کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ شام کے لئے حضرت علی کے تعیین کردہ گورنر (سہل بن

حنیف) کو بھی ماننے سے انکار کر دیا اور آگے بڑھ کر حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص لینے کے نام پر انھوں نے اپنے مؤیدین کو بھی جمع کر لیا۔ حضرت علی نے مصالحت کی کوششوں کے ناکام ہونے کے بعد اپنی فوج کے ساتھ شام کی طرف کوچ کیا اور صفین کے مقام پر تقریباً سو دن مصالحت کی کوشش کی جس کے بعد مجبوراً جنگ ہوئی جس میں حضرت علی کی فوج جیتنے لگی۔ ایسے موقعے پر معاویہ کی فوج نے نیزوں پر قرآن اٹھا کر تحکیم کا مطالبہ کیا۔ حضرت علی اس دھوکے کے خلاف تھے لیکن اپنے کچھ ساتھیوں کے اصرار پر انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ تحکیم میں دھوکے سے ایک غلط فیصلہ ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاویہ تو شام کے گورنر بنے رہے جبکہ حضرت علی کی فوج میں خلفشار پیدا ہو گیا اور تحکیم کے مسئلے کو لے کر تحکیم کے مؤیدین کی تکفیر شروع ہو گئی۔ نتیجۃً کافی لوگ حضرت علی کی فوج کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ لوگ "خوارج" یعنی باغی کہلائے جنہوں نے بعد میں سلطنت اسلامیہ کی بنیادیں کمزور کرنے میں بڑا رول ادا کیا۔ باطل کا یہ سب کام "اسلام" کے نام پر ہو رہا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے آج کے خوارج (القاعدۃ اور داعش وغیرہ) اسلام کے نام پر اسلام اور مسلمانوں کی جڑیں کھود رہے ہیں۔

مسلمانوں اور خوارج کے درمیان متعدد جنگیں ہوئیں مثلاً معرکۂ نہروان (سنہ ۳۹ھ / ۶۵۹ء)۔ اس خانہ جنگی کے باوجود حضرت علی کے زمانے میں بہت سے اہم کام ہوئے مثلاً پولیس کا محکمہ قائم ہوا، جیلوں کا قیام عمل میں آیا اور کوفہ میں فقہ و نحو کے مدرسے قائم ہوئے۔ حضرت علی کے حکم سے ابوالأسود الدؤلی نے پہلی بار قرآن پاک کے حروف کی تشکیل کی یعنی زیر و زبر وغیرہ لگایا تاکہ قرآن پاک پڑھنے میں آسانی ہو۔ حضرت علی نے پہلا اسلامی درہم بھی جاری کیا۔

اسی خانہ جنگی کی حالت میں عبد الرحمٰن بن ملجم نامی ایک خارجی نے حضرت علی پر نماز پڑھتے ہوئے مسموم تلوار سے حملہ کر دیا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ایسی حالت میں بھی حضرت علی نے عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا بلکہ حکم دیا: "أبصروا ضاربي! اطعموه من طعامي. واسقوه من شرابي. النفس بالنفس. إن هلكت فاقتلوه كما قتلني وإن بقيت رأيت فيه رأيي" (دیکھو میرے اوپر حملہ کرنے والا کون ہے۔ اس کو میرا کھانا کھلاؤ اور میرا پانی پلاؤ۔ نفس کا بدلہ نفس ہوتا ہے۔ اگر میں مر جاؤں تو اسے قتل کر دو جیسے اس نے مجھے قتل کیا اور اگر میں بچ گیا تو میں اس کے بارے میں غور کروں گا)۔

حضرت حسن مجتبیٰؓ نے حضرت امیر المؤمنین کی تدفین کے موقع پر جو خطبہ دیا وہ آپ کی شخصیت کا ایک مکمل خلاصہ ہے۔ آپؓ نے فرمایا: ”اے لوگو! تم سے ایک ایسا شخص رخصت ہو گیا جس سے نہ اگلے علم میں پیش قدمی کر سکیں گے اور نہ پچھلے اس کی برابری کر سکے۔ رسول اللہ ﷺ اس کے ہاتھ میں جھنڈا دیا کرتے اور اس کے ہاتھ پر فتح نصیب ہو جاتی تھی۔ اس نے چاندی سونا کچھ نہیں چھوڑا۔ اس نے اپنے وظیفے میں سے صرف ۷۰۰ درہم[1] ہم ورثاء کے لئے چھوڑے ہیں“۔

معروف شیعہ عالم شیخ مفید کے مطابق حضرت علیؓ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت حسنؓ کو وصیت کی کہ ان کو ایک خفیہ جگہ پر دفن کریں تاکہ دشمن ان کی قبر کی بے حرمتی نہ کر سکیں۔ یوں آپ کی قبر شریف عرصے تک مجہول رہی یہاں تک کہ عباسی خلافت کے دوران حضرت امام جعفر الصادق نے قبر کی جگہ بتادی جس کے بعد نجف اشرف میں قبر شریف پر بڑا مشہد بنایا گیا اور امام علی کی مسجد بنائی گئی۔

اہل سنت اور اہل تشیع دونوں امام علی کے اعلیٰ ترین مرتبے کے قائل ہیں۔ احادیث شریفہ کے مطابق حضرت علی عشرۂ مبشرہ میں شامل ہیں یعنی ان دس خوش نصیب لوگوں میں سے ایک ہیں جن کو ان کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت حضور پاک ﷺ نے دے دی تھی۔ اہل تشیع حضرت علی کی معصومیت کے قائل ہیں اور ان کو پہلا امام سمجھتے ہیں جبکہ اہل سنت کا یہ موقف نہیں ہے۔ اہل سنت امام علی کو اہل بیت کا حصہ مانتے ہیں اور ان کو خلیفۂ رابع سمجھتے ہیں۔ حضرت علی کے خلاف لغو باتیں جو بعض کتب میں ہیں، یا جن کو ان کے مخالفین دہراتے ہیں، وہ سب بنی امیہ کے دور کی ایجاد ہیں جنھیں ان کے تنخواہ دار مؤرخین اور قصہ گو لوگوں نے گھڑا اور پھیلایا۔

”نہج البلاغۃ“ حضرت علی کے اقوال پر مشتمل غیر معمولی حکمت و بلاغت کی کتاب ہے جسے الشریف الرضی نے ترتیب دیا۔ یہ کتاب نہ صرف تشیع اور اسلام کی اہم ترین کتب میں سے ہے بلکہ وہ انسانی علمی اور فکری ذخیرے کا بھی بہت اہم حصہ ہے۔ حضرت علی کے اشعار کا دیوان بھی

---

[1] ۷۰۰ درہم کے معنی ہیں ۵۰۳۸۰ روپے۔ درہم چاندی کا سکہ ہوتا تھا جس کا وزن 2.97 گرام تھا۔ سابقین اولین میں ہونے کی وجہ سے حضرت علی کو بیت المال سے ہر سال لاکھوں دینار ملتے تھے جو کہ سونے کا سکہ تھا اور ایک دینار کا وزن 4.25 گرام تھا یعنی ایک دینار کی قیمت ۵۸۴۷۱ روپے ہے (۲۵/مارچ ۲۰۲۶ کے ریٹ کے مطابق)

"انوار العقول من اشعار وصی الرسول "کے نام سے موجود ہے۔ ان کے اقوال حکیمانہ کو عبد الواحد الآمدی نے "غرر الحکم و درر الکلم" میں جمع کیا ہے۔ حضرت علی سے مختلف دعائیں بھی منقول ہیں جیسے دعاء کمیل، دعاء الصباح اور دعاء یستشیر۔ امام علی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن پاک کے تین نسخے آج بھی موجود ہیں جن میں سے ایک صنعاء (یمن) کے میوزیم میں ہے، دوسرا رام پور کی رضا لائبریری میں اور تیسرے نسخے کے اولین بارہ صفحات عراق کے المرکز الوطنی للمخطوطات میں اور باقی حصے نجف اشرف میں واقع مکتبہ امیر المؤمنین میں محفوظ ہیں۔

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کوفی عنان نے حضرت علی کے اپنے مصر کے گورنر مالک الاشتر کو لکھے گئے قول "یا مالک! اِن الناس اِما اَخ لک فی الدین أو نظیر لک فی الخلق" (اے مالک! لوگ یا تو تمہارے دینی بھائی ہیں یا تمہاری ہی طرح پیدا کئے گئے انسان ہیں) کے بارے میں کہا کہ اس عبارت کو تمام تنظیموں کے صدر دفاتر میں لکھ کر ٹانگ دینا چاہئے کیونکہ آج انسانیت کو مساوات کے اس پیغام کی شدید ضرورت ہے۔ کوفی عنان نے اقوام متحدہ کی قانونی کمیٹی سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ حضرت علی کے خط بنام مالک اشتر کے بارے میں غور کرے۔ چنانچہ مذکورہ کمیٹی نے کئی ماہ غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ یہ خط بین الاقوامی قانون کا ایک منبع (Source) ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم سنی ہوں یا شیعہ، ہم سب کے نزدیک امام علی ایک عظیم ترین اخلاقی، علمی، سیاسی اور قانونی نمونہ ہیں۔ ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم سال میں ان کو ایک بار یاد کر لیا کریں بلکہ ان کی عظمت کا حق اسی وقت ادا ہو گا جب ہم ان کے پیغام اور ان کے اسوہ کو اپنی روزمرہ کی زندگی کا بھی حصہ بنالیں۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ماضی کی تلخیوں کو بھول کر ہمیں آج کندھے سے کندھا ملا کر چلنا چاہئے۔ موجودہ دور میں اسلام کو جس چیلنج کا سامنا ہے، بلکہ اسے مٹانے کی جو سازشیں مغرب و مشرق میں رچی جارہی ہیں، ان کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی ہے۔ ہم کتنے بد نصیب ہونگے اگر ایسے وقت میں بھی آپس میں لڑتے رہیں جب مغرب اور مشرق میں اس کے ہمنوا شیعہ اور سنی دونوں اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔

شیخ العالم کے کلام میں نوجوانوں کے لئے ہدایت

اشتیاق احمد وگے
سینئر ریسرچ اسکالر، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر
Ishtiyaq.wagay@gmail.com

وادی کشمیر ایک ایسی سرزمین ہے جہاں صدیوں سے فکری، ثقافتی، اور روحانی روایات کا امتزاج ایک منفرد شناخت کی صورت میں ابھرا ہے۔ یہ وادی نہ صرف اپنی جغرافیائی دلکشی کے لیے مشہور ہے بلکہ ایک ایسی روحانی گہرائی کی حامل ہے جو اسے انسانی فکر اور تہذیب کے سنگم کا گہوارہ بناتی ہے۔ اس سرزمین کی فکری اور روحانی تاریخ میں شیخ العالم (۱۳۷۷۔ ۱۴۴۰ء)، جنہیں "نند ریشی" یا "شیخ نور الدین" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ایک ایسی شخصیت کے طور پر نمایاں ہیں جنہوں نے اپنی شاعری اور عملی زندگی کے ذریعے کشمیر کی سماجی اور روحانی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ چودھویں صدی عیسوی میں جموں وکشمیر کے ضلع کولگام میں واقع گاؤں قیموہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری، جو مقامی کشمیری زبان کے سادہ لیکن پر اثر استعارات سے مزین ہے، ایک ایسی حکمت پیش کرتی ہے جو انسان کو اس کے وجود کے جوہر، اس کی ذمہ داریوں، اور اس کی فطرت سے جوڑتی ہے۔

ان کا پیغام مقامی کشمیری ثقافت کے رنگ میں ڈھلا ہوا ہے، لیکن اس کی گہرائی عالمگیر انسانی اقدار سے ہم آہنگ ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک ایسی روحانی تحریک کو جنم دیا جو نہ صرف مذہبی اصلاح کا باعث بنی بلکہ سماجی ہم آہنگی، فکری بیداری، اور انسانی خدمت کو بھی فروغ دیا۔ ان کی تعلیمات انسان کو اپنی اندرونی طاقت سے روشناس کراتی ہیں، اور اسے ایک ایسی زندگی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں جو مقصد، توازن، اور خدمت سے بھرپور ہو۔ موجودہ دور میں، جب کشمیری معاشرہ عالمگیریت، تکنیکی ترقی، اور سماجی تبدیلیوں کے دباؤ سے گزر رہا ہے، شیخ العالم کی تعلیمات ایک ایسی لنگر گاہ ہیں جو نئی نسل کو اپنی جڑوں سے جوڑ سکتی ہیں، اور انہیں ایک ایسی سمت دکھا سکتی ہیں جو ان کی زندگی کو معنویت اور استحکام عطا کرے۔

شیخ العالم کا فکری و روحانی ورثہ: شیخ العالم انسان کے مقام کو ایک ایسی عظیم تخلیق کے طور پر پیش کرتے ہیں جو عقل و شعور سے نوازا گیا ہے[۱]۔ اس فطری عزت کو سمجھ کر انسان اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے ایک اعلیٰ مقصد کی طرف بڑھتا ہے، جو اسے اپنی اندرونی طاقت سے روشناس کراتا ہے۔ یہ نظریہ انسان کو اپنی زندگی کے مقصد کی طرف رہنمائی کرتا ہے[۲]۔ جہاں شیخ العالم اللہ کی رضا اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی کو زندگی کا سب سے عظیم مقصد قرار دیتے ہیں، جو انسان کو دنیاوی خواہشات کی بھول بھلیاں سے نکال کر روحانی اطمینان کی طرف لے جاتا ہے، اور اسے ایک ایسی راہ دکھاتا ہے جہاں مشکلات بھی روحانی سفر کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ روحانی سفر عقل اور وحی کے توازن پر منحصر ہے، جسے شیخ العالم رہنمائی کا بنیادی ستون مانتے ہیں۔ وہ عقل کی حدود کو تسلیم کرتے ہوئے اسے وحی کی روشنی سے مکمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں[۳]، تاکہ انسان فکری گمراہی سے محفوظ رہ کر حق کی طرف گامزن ہو، اور اس توازن کے ذریعے وہ اپنی عقل کو دینی اقدار کے تابع کر کے ایک متوازن زندگی گذارے۔ اس توازن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے، شیخ العالم جوانی اور وقت کو اللہ کی عظیم نعمتیں قرار دیتے ہیں، جن کی قدر کرتے ہوئے انسان اپنی توانائی کو نیک اعمال کی طرف موڑتا ہے[۴]، اور جوانی کی قوت کو ایک ایسی سرمایہ کاری میں بدلتا ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں ثمرات دیتی ہے۔ وہ وقت کو ایک عظیم موقع کے طور پر دیکھتے ہیں[۵]، جو انسان کو اپنے مقصد کے قریب لے جاتا ہے، بشرطیکہ اسے مثبت سمت میں استعمال کیا جائے۔ یہ مثبت سمت جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں، جسے شیخ العالم انسان کے مقصد تک پہنچنے کا پل قرار دیتے ہیں،[۶] جہاں استقامت اور محنت مشکلات کو ایک روحانی لذت میں بدل دیتی ہے، اور انسان کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اللہ کے قریب ہونے کی ترغیب دیتی ہے[۷]؛ یہ نظریہ

---

[۱] جی ایم شاد، کلامِ شیخ العالم، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۳ء، ص ۶۲۔

[۲] ماخذ سابق، ص ۲۱۷۔

[۳] ماخذ سابق، ص ۴۳۔

[۴] ماخذ سابق، ص ۱۹۸۔

[۵] ماخذ سابق، ص ۶۳۔

[۶] ماخذ سابق، ص ۲۱۰۔

[۷] ماخذ سابق، ص ۲۳۴۔

صبر اور عزم کو ایک ایسی قوت کے طور پر پیش کرتا ہے جو انسان کو روحانی اور سماجی کامیابی کی طرف لے جاتی ہے۔

نوجوانوں کے مسائل اور شیخ العالم کی تعلیمات: کشمیری نوجوان آج متعدد مسائل سے دوچار ہیں، جن کی جڑیں روحانی، اخلاقی اور معاشی / سماجی بحرانات میں ہیں۔PSCSJ کی رپورٹ کے مطابق، ۱۳٫۵ لاکھ سے زائد لوگ جموں و کشمیر میں منشیات کی لت کا شکار ہیں[۸]، جبکہ ۱۳ فیصد سے زائد نوجوان تعلیم ترک کر رہے ہیں[۹]، جو بے روزگاری اور مایوسی کو جنم دے رہا ہے۔ سوشل میڈیا کے منفی اثرات نے فحاشی، فکری ارتداد، اور سماجی قطع تعلق کو بڑھاوا دیا ہے۔ شیخ العالم کی شاعری ان مسائل کے نظریاتی حل پیش کرتی ہے، جو ان کے فکری و روحانی ورثے سے جڑتے ہیں۔

روحانی مسائل مایوسی: شیخ العالم نورالدین ریشیؒ کی تعلیمات میں سب سے زیادہ نمایاں پہلو انسان کو مایوسی سے بچانے اور اللہ تعالیٰ پر کامل توکل پیدا کرنے کی تلقین ہے۔ اُن کی شاعری میں انسان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اصل حقیقت ہے، اور وہی ہر وقت اور ہر حال میں انسان کے ساتھ ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

سُے ہو اوس تَے سُے ہو آسی سُے سُے کری زِ ہا زُوو
سُے ساری اندیشہ کاسی ہتا زود پالیس پیتو![۱۰]

(نہ تھا جب کچھ وہی تھا، جب نہ کچھ ہو گا وہی ہو گا۔ تو اُس کا ذکر کرتا رہ۔ ترے اندیشے جتنے بھی ہوں سارے دور کر دے گا۔ میری جان! خود سنبھلتے رہ)

اس شعر میں شیخ العالمؒ نوجوان کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ دنیاوی دکھ، محرومیاں یا ناکامیاں انسان کو کبھی اس حد تک نہ لے جائیں کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو کر خودکشی جیسا انتہائی قدم

---

(۸) "Over 13.5 Lakh Battle Drug Abuse in JK, 1.6 Lakh Aged 10-17," *Kashmir* Life, 26 June 2025. For details, see https://kashmirlife.net/over-13-5-lakh-battle-drug-abuse-in-jk-1-6-lakh-aged-10-17-395187/

(۹) "Dropout rate in J&K Declines at Primary level but worsens at secondary stage: Centre," *Kashmir News Service*, 21 July 2025. For details, see https://www.knskashmir.com/dropout-rate-in-jandk-declines-at-primary-level-but-worsens-at-secondary-stage--centre-196562

(۱۰) شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۴۵؛ اسد اللہ آفاقی، کلیات شیخ العالم، لائف فاؤنڈیشن، چرار شریف، ۲۰۰۸ء، ص ۸۶۔

اٹھائے۔ وہ انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ اصل حقیقت صرف اللہ کی ذات ہے، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کی یاد اور ذکر سے ہی دل کے غم اور اندیشے دور ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں فرمایا گیا ہے: ''اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ کی رحمت سے کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں''۔[۱۱] یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ایمان والے کبھی بھی مشکلات یا محرومیوں کے باوجود اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ نوجوانی کے دور میں جب جذبات شدت اختیار کر لیتے ہیں اور ذرا سی ناکامی بڑے غم کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اُس وقت قرآن کی یہ تعلیم ایک مضبوط سہارا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے کسی مصیبت کی وجہ سے جو اسے پہنچی ہو، بلکہ یوں کہے: اے اللہ! جب تک زندگی میرے لئے بہتر ہے مجھے زندہ رکھ، اور جب موت بہتر ہو تو مجھے موت دے دے''۔[۱۲] یہ حدیث خودکشی اور مایوسی کے رجحان کے مقابل ایک عملی رہنمائی پیش کرتی ہے۔ اسلام زندگی کو اللہ کی امانت سمجھتا ہے اور اس امانت کو اپنی مرضی سے ختم کرنے کو سخت منع کرتا ہے۔ شیخ العالمؒ کی تعلیمات نوجوانوں کو یہ سکھاتی ہیں کہ دنیاوی دکھ، غربت، ناکامی یا محرومی انسان کی اصل حقیقت کو کمزور نہیں کرتے۔ اصل حقیقت اللہ کی ذات ہے، اور اس کی یاد سے ہی دل کو سکون ملتا ہے۔ نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کے ذکر کو اپنا سہارا بنائیں، اس کی رحمت پر بھروسہ رکھیں اور مشکلات کو عارضی سمجھ کر صبر و استقامت سے کام لیں۔

شیخ العالمؒ نے جس طرح اپنی سادہ زندگی اور ذکر الٰہی کو اپنایا، وہ نوجوانوں کے لئے بہترین مثال ہے۔ ان کا پیغام یہ ہے کہ زندگی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے اور اسے برباد کرنے یا ختم کرنے کا اختیار انسان کو نہیں۔ مایوسی کا علاج اللہ کی یاد اور اس پر کامل توکل ہے۔ تاریخی طور پر، شیخ العالم نے کشمیر کے مشکل حالات میں لوگوں کو اللہ کے ذکر اور امید سے جوڑا، جو معاشرتی استحکام کا باعث بنا۔ موجودہ دور میں، جہاں معاشی دباؤ اور سیاسی عدم استحکام نے مایوسی کو بڑھایا ہے، یہ شعر نوجوانوں کو یاد دلاتا ہے کہ اللہ کا ذکر اور اس سے امید ان کے اندیشوں کو دور کر سکتی ہے۔ یہ پیغام کشمیری نوجوانوں کو روحانی خلا سے نکال کر اللہ کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جو ان کی

---

[۱۱] القرآن، سورہ یوسف: ۸۷۔

[۱۲] امام ابو عبداللہ محمد اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، ترجمہ: وحید الزماں، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء، جلد ۳، ص: ۳۰۶، حدیث ۶۳۰۔

زندگی کو استحکام دیتی ہے۔

فکری ارتداد: نوجوانی کا دور انسان کی شخصیت کے فکری اور اعتقادی پہلو کو تشکیل دیتا ہے۔ اس عمر میں انسان سوالات کرتا ہے، نئے رجحانات اپناتا ہے اور اکثر گمراہ کن نظریات کے اثر میں آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکری ارتداد، یعنی ایمان ویقین سے انحراف یا باطل خیالات کے زیرِ اثر دین سے دور ہونا، آج کے نوجوانوں کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ شیخ العالم نورالدین ریشیؒ نے اپنی شاعری میں اس خطرے کی طرف نہایت حکیمانہ انداز میں متوجہ کیا ہے:

آو ژُوراہ لُوٹنِہ گھرَے ووند شیطان ظاہِر شُونتو
نصر! بر تُروپر، لاران چُھ ییے مَکر سَرس لبہ ہس نہ وونتو[۱۳]

(ایک ایسا شاطر و ماہر چور ہمارے گھر (دل و دماغ اور دولت اور ایمان) کو لوٹنے آیا ہے جو اپنی فطرت و خصلت سے شیطان ہے لیکن ظاہری صورت میں بہت ہی شانت یعنی مرنجان مرنج اور ٹھنڈا دکھائی دیا ہے۔ نصر بابا! (دل و دماغ اور چشم و گوش) کے دروازے کو محکم طور پر بند رکھ۔ وہ تیرے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اس کے مکر و فریب کی جھیل بہت گہری ہے۔ تم اس کی تھاہ کو نہیں پاسکتے ہو)

یہ شعر دراصل نوجوان نسل کے لئے ایک واضح تنبیہ ہے کہ باطل افکار اور شیطانی وساوس ہمیشہ دل و دماغ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ گمراہی اکثر دلکش الفاظ، خوشنما نظریات اور بظاہر معصوم صورتوں میں سامنے آتی ہے لیکن درحقیقت یہ ایمان کو کمزور کرنے اور انسان کو ارتداد کی طرف لے جانے کا ایک جال ہے۔ قرآن کریم نے شیطان اور اس کے پیروکاروں کے فریب سے بچنے کے لئے بار بار خبردار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے، پس تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ جہنم والوں میں شامل ہو جائیں“۔[۱۴] یہ آیت اس بات کو اجاگر کرتی ہے کہ شیطان اور باطل نظریات ہمیشہ انسان کو دین سے دور کرنے اور آخرت کی بربادی کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا: ”آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، پس دیکھو تم میں سے کون کس کو اپنا دوست بناتا ہے“۔[۱۵] یہ حدیث اس بات کی گہرائی کو واضح کرتی ہے کہ انسان کے افکار و عقائد پر

---

[۱۳] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۳۲۶؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۲۵۰۔

[۱۴] القرآن، سورہ فاطر: ۶۔

[۱۵] امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابوداؤد، ترجمہ: ابوعمار عمر فاروق سعیدی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء،

اس کی صحبت اور ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے۔

شیخ العالمؒ نوجوانوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ دل و دماغ کے دروازوں کو غیر محفوظ نہ چھوڑیں۔ بصری اور سمعی ذرائع (آنکھ اور کان) کے ذریعے باطل افکار انسان کے اندر سرایت کر جاتے ہیں، لہٰذا ان پر پہرا دینا ضروری ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ شیطان بظاہر خوش اخلاق اور نرم خو دکھائی دیتا ہے لیکن اندر سے خالص دشمن ہے۔ نوجوان نسل کے لئے شیخ العالمؒ کی یہ رہنمائی آج کے دور میں اور بھی زیادہ اہم ہے جب کہ سوشل میڈیا، سیکولر نظریات، اور مادہ پرستانہ فکر مختلف شکلوں میں ایمان کو چوری کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا پیغام یہ ہے کہ علمِ دین اور ذکرِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامے رکھو تاکہ باطل نظریات کی لہر ایمان کو متزلزل نہ کر سکے۔

اخلاقی مسائل: صحبت: صحبت یعنی ہم نشینی اور رفاقت انسانی زندگی کی تعمیر یا بربادی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ماحول اور اپنے قریب رہنے والے لوگوں سے اثر قبول کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان نیک اور صالح لوگوں کی صحبت اختیار کرے اور فاسق و فاجر کی ہم نشینی سے بچے۔ شیخ العالم نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے اسی حقیقت کو نہایت پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

انگہ زن خوشبو موکھ زن وُدے نِشہ وُدین ہیتھ کتھن مان
سو ستے کریہ تہ رُوستُے کروُدے سُے یے دپی زِ مسلمان[۱۶]

(جس شخص کا انگ انگ توحید کی خوشبو سے مہکتا ہے اور چہرہ مومن کا نور لئے ہے، وہ صالحین کی صحبت میں رہ کر ان کی نیک باتوں کو دھیان سے سن کر ان پر عمل کرتا ہے۔ وہ نیک اعمال کی انجام دہی پر ہمیشہ مستعد اور برائیوں سے دور رہتا ہے۔ اسی نیک بخت کو حقیقی مسلمان کہہ سکتے ہیں)

یہ شعر اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ نیک صحبت انسان کی سیرت کو جِلا بخشتی ہے، اس کے کردار کو نکھارتی ہے، اور اسے اللہ کے قریب کر دیتی ہے۔ اس کا عکس قرآن مجید کی اس آیت میں ملتا ہے: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ"۔[۱۷] یہاں "صادقین" کے ساتھ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اہلِ ایمان اور صالحین کی صحبت اختیار کرو تاکہ تمہارے اندر

جلد ۴، ص: ۶۶۰۔۶۶۱، حدیث ۴۸۳۳۔

[۱۶] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۱۲۷؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۲۲۱۔

[۱۷] القرآن، سورہ توبہ: ۱۱۹۔

بھی وہی نور، سچائی اور تقویٰ پیدا ہو۔ شیخ العالم کی ایک اور نصیحت نہایت دلنشین ہے:

نُندین ستین سَنز کران لسی زے پرزلگھ لگی شاہ وولگے کنز
ڈیٹھین ستین سَنز کران ژسی زے اژی زِ نہ تَمنین بانَن منز[۱۸]

(میرے عزیز! دیندار متقی اور موحد کی صحبت اختیار کر کے کامیاب زندگی گزارنے کا انتظام کرو۔ تیرا وجود اور ضمیر اس طرح صاف و شفاف اور نورانی اور پاک ہو جائے گا جیسے اوکھلی میں "شاہ ولگ" [دھان کی اعلیٰ قسم] کوٹ کر چمک کے صاف و شفاف ہو کر اُس کی خوشبو اور بھی کھل اُٹھے گی۔ بُرے [بے دین، مشرک، بدعتی، بد کردار] لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرو اور اُن سے ڈرتے رہو۔ کالک لگے ہوئے برتنوں میں مت بیٹھو۔ صالح صحبت تجھے صالح اور بُری صحبت تجھے بُرا ہی بنائے گی)

یہ مثال نہایت پر اثر اور حقیقت افروز ہے۔ جیسے صاف اناج کو کوٹنے کے بعد اس کی اصل خوشبو اور نورانیت ظاہر ہو جاتی ہے، ویسے ہی نیک صحبت انسان کے دل و دماغ کو صاف کر دیتی ہے۔ دوسری طرف، بُری صحبت بالکل کالک لگے برتن کی مانند ہے جس میں بیٹھنے سے انسان خود بھی سیاہ اور آلودہ ہو جاتا ہے۔ یہی تعلیم ہمیں حضور اکرم ﷺ کی احادیث میں بھی ملتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اچھے ساتھی اور بُرے ساتھی کی مثال مشک (خوشبو) اٹھانے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی طرح ہے۔ مشک والا یا تو تمہیں خوشبو دے گا، یا تم اس سے خرید لو گے، یا کم از کم اس کی خوشبو تمہیں ملے گی۔ اور بھٹی والا یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گا یا تمہیں بدبو سے دوچار کرے گا۔[۱۹]

شیخ العالم کے اشعار اس حدیث کی عملی تشریح معلوم ہوتے ہیں۔ نیک صحبت انسان کے باطن کو خوشبو کی طرح معطر کرتی ہے، جب کہ بری صحبت بدبو اور نقصان چھوڑ جاتی ہے۔ شیخ العالم کی یہ تعلیم کہ صحبت انسان کی اصل پہچان بن جاتی ہے، آج کے دور میں بھی نہایت اہم ہے۔ نوجوان جب بری صحبت اختیار کرتے ہیں تو اُن کے اخلاق و افکار میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ آج کے زمانے میں سوشل میڈیا، غلط رفاقت اور بے مقصد محفلیں نوجوانوں کو دین و اخلاق سے دور کر دیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ ذہنی انتشار، گمراہی اور بے عملی کی صورت میں نکلتا ہے۔

---

[۱۸] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۲۲۵؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۲۰۳۔

[۱۹] امام بخاری، صحیح بخاری، جلد ۱، حدیث ۱۹۷۲، ص: ۸۳۹۔

اسی لیے شیخ العالم نے تاکید فرمائی کہ نیک صحبت اختیار کرنا دراصل اپنے ایمان، ضمیر اور شخصیت کو محفوظ کرنا ہے۔ ان کا پیغام نوجوانوں کے لئے واضح ہے کہ وہ صالحین، علماء، نیک والدین اور مخلص دوستوں کے ساتھ وقت گزاریں تاکہ وہ اپنی زندگی کو مقصدی اور پاکیزہ بنا سکیں۔ شیخ العالم نے کشمیر میں صالحین کی صحبت کو فروغ دیا، جو اخلاقی اصلاح کا باعث بنا۔

فحاشی و نفس پرستی: شیخ العالم نے اپنی شاعری کے ذریعے جس دور کی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو موضوع بنایا وہ درحقیقت انسانی فطرت کی وہ کمزوریاں ہیں جو ہر دور میں معاشرے کو کھوکھلا کرتی رہی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی آفتیں منشیات اور فحاشی ہیں۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جو فرد کی روحانیت کو تباہ کر دیتی ہیں اور معاشرے کو اجتماعی زوال کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔ قرآن و سنت بھی ان دونوں سے سختی سے منع کرتے ہیں۔ قرآن میں شراب اور نشہ آور اشیاء کے بارے میں فرمایا گیا: "اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے شیطان کے گندے کام ہیں۔ ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔[۲۰] اسی طرح فحاشی کے بارے میں قرآن کہتا ہے: "زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے"[۲۱] ان قرآنی تعلیمات کو شیخ العالمؒ نے اپنے وقت کی زبان اور اپنی شاعری کے انداز میں اس طرح بیان کیا کہ عام عوام بھی ان کی گہرائی کو سمجھ سکیں:

تیلہِ مالِہ آسَن تِتھی کیرَن ٹنگ ژُونٹھی پَیَن ژیرَن ستی
ماجِہ کورِ اتھ واس کرِتھ نیرَن دوہ دین برَن غارَن ستی
خوش ییہ حقس دنی یاہ لُورن تیلہِ مالِہ آسی واندَر راج[۲۲]

(وہ وقت ایک دوسرے سے مخالف چیزوں کے ایک ساتھ واقع ہونے کا ہوگا (یعنی دور اجتماع ضدین)۔ ناشپاتی اور سیب جن کے پکنے کا موسم اصل میں خزاں ہے وہ خوبانیوں کے ساتھ موسم گرما میں ہی پک جائیں گے۔ فحاشی، بے شرمی اور بے غیرتی کا ایسا دور دورہ ہوگا کہ ماں بیٹی دونوں ساتھ ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکلیں گی اور اپنا دن نامحرم مردوں کے ساتھ گزاریں گی۔ جب تم ایسے واقعات رونما ہوتے دیکھو گے تو سمجھ لو کہ اللہ کا غضب وحشی اور

---

[۲۰] القرآن، سورہ مائدہ: ۹۰۔

[۲۱] القرآن، بنی اسرائیل: ۳۲۔

[۲۲] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۳۹۹؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۳۶۲۔

خونخوار بندروں کی فطرت رکھنے والے ظالم و جابر اور بد کردار حکمرانوں کی صورت میں ملک اور قوم پر نازل ہو گا۔ جب یہ صورت حال حد سے زیادہ گزر جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس دنیا کو ختم کر دے گا)

یہ شعر محض اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ ایک اخروی تنبیہ بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب انسان اپنی حدود پھلانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر ایسے حکمران مسلط کرتا ہے جو ان کے اعمال کی سزا بن جاتے ہیں۔[۲۳] یہاں شیخ العالمؒ کا اشارہ ہے کہ فحاشی اور بے حیائی صرف فرد کا ذاتی مسئلہ نہیں بلکہ، یہ پورے معاشرے کو تباہ کرتی ہے اور اللہ کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے۔ شیخ العالمؒ فرماتے ہیں:

یَتھ جایہ دَف تہ دمامہ آسِہ وَزان تتھ جایہ شیطان روزان آسی
ینہ آسِہ پزان، تی آسَن کران توَے اسمانہ بلاے وَسان آسی[۲۴]

(جس جگہ مزامیر، دف، ڈھول، رباب، وغیرہ بجائے جاتے ہوں، شیطان بھی وہیں پر ہو گا۔ شیطان غافل مسلمان کے تضیع اوقات اور لہو ولعب میں اُس کے مشغول ہونے پر خوش ہوتا ہے۔ ایسی مجلسوں میں جہاں مزامیر بجائے جاتے ہوں ایسی باتیں بھی ہوتی ہوں گی جو مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ انہی وجوہات سے آسمان سے بلائیں نازل ہوتی ہیں۔)

یہ اشعار ہمیں حدیث کی طرف لے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یقیناً میری امت میں کچھ لوگ ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور موسیقی کے آلات کو حلال کر لیں گے"۔[۲۵] شیخ العالمؒ نے اس شعر کے ذریعے وہی بات دہرائی ہے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ جہاں فضول اور لغو کام ہوں گے وہاں برکت نہیں بلکہ نحوست اور بلائیں نازل ہوں گی۔ یہ اشعار اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ جوانی اگر شہوت پرستی میں ضائع ہو جائے تو یہ سب سے بڑی بربادی ہے۔ شیخ العالمؒ فرماتے ہیں:

نفس پتہ لگن چُھے اچھی منز سِرین گاٹیچ وومید بری زِ نہ زانہہ

---

[۲۳] القرآن، سورہ انعام:۱۲۹۔

[۲۴] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص۳۲۵؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص:۲۸۱۔

[۲۵] امام بخاری، صحیح بخاری، جلد۳، حدیث۵۴۸، ص:۲۷۸۔

نفس پتہ لگن چُھے آر منزی یِرُن ہلِس تہ میدِس کری واہ واہ[۲۶]

(نفس امارہ کا پیچھے پڑنا آنکھ میں شالی (دھان) کے دانے کی نازک مگر تیز نکیلی دُم کے گھسنے کی مانند ہے جس سے آنکھ شدید زخمی ہوتی ہے اور بصارت کی اُمید کم ہی رہتی ہے۔ نفس امارہ کا پیچھے پڑنا طوفانی دریا کے تیز بہاؤ کے ساتھ بہنا ہے جو بڑی بڑی چٹانوں اور درختوں کو توڑ پھوڑ کر کے بہا کے لے جاتا ہے۔ وہ کسی بھی چیز کو اپنی اصلی صورت پر نہیں رکھتا ہے۔ ٹیڑھے میڑھے (یعنی نفس امارہ گمراہوں) سے خوش ہوتا ہے، انہیں شاباشی دیتا ہے۔)

یہ نفسِ امارہ کی حقیقت ہے جسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے: "بے شک نفس برائی پر اکساتا ہے سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم کرے"۔[۲۷] شیخ العالمؒ کی تشبیہات نہایت پر اثر ہیں۔ جیسے طوفان راستے میں سب کچھ بہا دیتا ہے، ایسے ہی شہوات اور نفسِ امارہ انسان کے ایمان و کردار کو بہا کر لے جاتے ہیں۔

معاشی اور سماجی مسائل: بے روزگاری اور رزق کی فکر: انسانی زندگی کے بڑے سوالات میں سے ایک سوال رزق کا ہے۔ صدیوں سے انسان اپنی روزی روٹی کے بارے میں فکر مند رہا ہے۔ کبھی یہ فکر غربت اور تنگدستی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی لالچ اور حرص کی شکل میں۔ قرآن و حدیث میں بارہا تاکید کی گئی ہے کہ رزق کا ذمے دار اللہ تعالیٰ ہے لیکن بندے پر لازم ہے کہ وہ محنت کرے اور رزق کے حصول کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا غم نہ بنائے۔ شیخ العالم نے اپنے کلام میں اس حقیقت کو نہایت سادہ مگر مؤثر پیرایے میں بیان کیا۔ ان کے اشعار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بندہ اللہ پر اعتماد رکھے، اور بے روزگاری یا فقر کے خوف میں اپنی عبادت اور اطاعت کو نہ بھولے:

عمر وِیدُن اکُے پچھَاہ رِزقہ رُس اکھ مچھاہ مو[۲۸]

(میرے دوست! اپنی عمر کو مختصر سمجھتے ہوئے اس کی بندگی دل و جان سے بجالاؤ۔ رزق کی فکر میں پریشان نہ ہو۔ کوئی مکھی بھی اُس کے رزق سے محروم نہیں ہے)

---

[۲۶] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۲۴۵؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۹۸۔

[۲۷] القرآن، سورہ یوسف: ۵۳۔

[۲۸] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۴۱؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۸۶۔

یہ شعر دراصل انسانی زندگی کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عمر مختصر ہے، لہٰذا اسے بے معنی فکر میں ضائع کرنے کے بجائے اللہ کی بندگی میں گزارنا چاہیے۔ شیخ العالم رزق کی فکر کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ رزق کی ضمانت خود اللہ نے دی ہے۔ قرآن مجید میں صاف فرمایا گیا: "زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو"۔[۲۹] شیخ العالمؒ نے مکھی کی مثال دے کر بتایا کہ جس معمولی مخلوق کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے، اس کے رزق کا بھی انتظام اللہ کرتا ہے۔ پھر انسان جیسی مکرم مخلوق کے بارے میں فکر کرنا بے جا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اگر تم اللہ پر ویسے ہی توکل کرو جیسے کہ توکل کا حق ہے، تو تمہیں ایسے رزق دیا جائے گا جیسے پرندے کو دیا جاتا ہے۔ وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ لوٹتے ہیں"۔[۳۰] شیخ العالم فرماتے ہیں:

رزق چُھے برونہہ برونہہ موت پتہ پتّے دُنیا چُھے سفرُک اَتہ گتھ
سرتَن مولا گار تہنز وتَے ستی نِکھ نیک یا بد ارزتھ[۳۱]

(تیرے پیدا ہونے سے پہلے ہی تیرا رزق مقرر ہو چکا ہے لیکن یاد رکھ اس کے بعد موت بھی ہے اور دنیا سفر کا آنا جانا ہے۔ اپنے مولا سے لو لگالو اور اُس کے بتائے ہوئے راستے پر چلو۔ تم اپنے ساتھ بری یا اچھی کمائی ہی لے سکتے ہو۔)

یہ شعر قضا و قدر کے عقیدے کی ترجمانی کرتا ہے۔ انسان کا رزق اس کی پیدائش سے پہلے ہی لکھ دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "فرشتہ ماں کے رحم میں آکر لکھتا ہے: اس کی عمر، اس کا رزق، اس کے اعمال اور وہ شقی ہے یا سعید۔"[۳۲] شیخ العالم نے محنت اور توکل کی ثقافت کو فروغ دیا، جو کشمیر میں معاشی استحکام کا باعث بنا۔ موجودہ دور میں جہاں بے روزگاری اور معاشی دباؤ نے نوجوانوں کو مایوس کیا ہے، یہ اشعار انہیں توکل اور محنت کے ذریعے معاشی چیلنجز سے نمٹنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

---

[۲۹] القرآن، سورہ ھود:۶۔

[۳۰] امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، جامع سنن ترمذی، تحقیق: محمد ناصر الدین البانی، ترجمہ: علی مرتضیٰ طاہر، دار العلم، ممبئی، ۲۰۱۹، جلد ۴، ص:۲۱۶۔۲۱۷۔

[۳۱] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۲۰۴؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۸۷۔

[۳۲] امام بخاری، صحیح بخاری، جلد ۲، حدیث ۵۶۰، ص:۲۹۰،۲۹۱۔

سماجی قطع تعلق اور وقت پر شادی کرنا: شیخ العالم کی شاعری محض وجدانی اور صوفیانہ واردات کا بیان نہیں بلکہ ایک جامع اخلاقی، سماجی اور دینی رہنمائی بھی فراہم کرتی ہے۔ ان کے اشعار میں جہاں توحید، روحانیت اور سماجی عدل کا سبق ملتا ہے، وہیں گھر گرستی، نکاح اور معاشرتی ذمہ داریوں کے حوالے سے بھی واضح اور بلیغ ہدایات موجود ہیں۔ شیخ العالم نے انفرادی ریاضت کو اجتماعی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی تعلیم دی ہے، اور ترکِ دنیا کو دین کا مقصد نہیں قرار دیا۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ یہ حقیقت ملتی ہے کہ انسان کی تکمیل اور سماج کی بقا کا انحصار شادی اور گھر گرستی کے نظام پر ہے۔ شیخ العالم فرماتے ہیں:

وجود تراوِتھ موجُود سورُم پر موکھ وُچھم پنُن پان[۳۳]

(کائنات (کی تخلیق) اور موجوات (یعنی موجود) پر غور و فکر سے ہی میں اس یکتا واجب الوجود کو جان سکا، پھر میں نے اسی عقیدۂ توحید کی کسوٹی پر اپنے آپ کو بار بار پرکھا۔)

یہ شعر انسان کی فکری بنیاد پر زور دیتا ہے۔ شیخ العالم کہتے ہیں کہ خالق کی معرفت محض ظاہری رسومات یا محض عقلی قیاس سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ تفکر اور تدبر فی الخلق سے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں بار بار آتا ہے: "بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں رات اور دن کے آنے جانے میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں"۔[۳۴] شیخ العالمؒ اسی قرآنی دعوتِ فکر کو دہراتے ہیں۔ اس شعر کا تعلق شادی اور معاشرتی تعلقات سے یوں جڑتا ہے کہ جب انسان اپنی بنیاد کو توحید پر استوار کرتا ہے تو اس کی گھریلو زندگی، اس کے سماجی روابط اور اس کے معاشرتی فیصلے سب اسی بنیاد پر درست سمت اختیار کرتے ہیں۔ یوں یہ شعر "فکری بنیاد" فراہم کرتا ہے جس پر "گھر گرہستی" کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ شیخ العالم مزید فرماتے ہیں:

گر گراکَس تاج لاگنَس سَرَس گر کور رسولِ خودایَن آو ہرس ٹوٹھو
گر گراکھ گور چھے باژن تہ گرَس گر گراکھ نو سمسَارَس روٹھو[۳۵]

گھر گرستی کی زندگی احکام الٰہی کے تحت گزارنا ایک مومن کے لئے ضروری ہے۔ نبی برحق ﷺ نے فرمایا: "نکاح میری سنت ہے جو اس سے منہ موڑے گا وہ میرا نہیں ہے"۔ خود

---

[۳۳] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۴۲؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۸۳۔

[۳۴] القرآن، سورہ آل عمران: ۱۹۰۔

[۳۵] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۲۷۶؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۲۴۴۔

آنحضور ﷺ نے گھر بسایا تھا، نکاح کیا اور بچوں کی پرورش کی۔ جو قرآن وسنت کے مطابق اپنا گھر بساتا ہے وہ عزت کے قابل ہے۔ گھر کا سربراہ اپنے اہل وعیال کا مربی اور رہبر ہوتا ہے، وہ دنیا سے بیزار نہیں ہوتا ہے، نہ بن باس لیتا ہے نہ غار نشین بنتا ہے۔ وہ جدوجہد کر کے حلال روزی کماتا ہے اور اپنے اہل وعیال کو پالتا ہے۔

شیخ العالم نے کشمیر میں خاندانی نظام کو مضبوط کیا، جو سماجی ہم آہنگی کا باعث بنا۔ موجودہ دور میں شادی میں تاخیر اور سماجی قطع تعلقی نے معاشرے کو کمزور کیا ہے۔ شیخ العالم گھر بسانے کو دینی فریضہ اور سماجی ضرورت قرار دیتے ہیں۔

آفاقی روحانی اصول: دنیا سے عدم وابستگی: شیخ العالم کے کلام میں دنیا کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ ایک مرکزی مضمون کے طور پر ابھرتا ہے۔ وہ بارہا انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ دنیا محض ایک عارضی ٹھکانہ ہے، جس سے کسی بھی قسم کی پائیدار امید وابستہ نہیں کی جاسکتی۔ اُن کا یہ پیغام براہِ راست قرآن وسنت کی اس تعلیم سے ہم آہنگ ہے جس میں دنیا کو "متاعِ غرور" [۳۶] اور "لعب ولہو"[۳۷] قرار دیا گیا ہے۔ شیخ العالم فرماتے ہیں:

بہ یود زانہ ہا دُنیا چُھ کینہ نَے نا حقہ دُنیا ہیچ بَرہا نہ برانت[۳۸]

(کاش میں سمجھ گیا ہوتا کہ یہ دنیا بالکل ہیچ ہے تو ہرگز اس کے ساتھ کوئی اُمید وابستہ نہیں رکھتا)

یہاں شیخ العالم دنیا کو ایک بازار سے تشبیہ دیتے ہیں، جہاں لین دین اور سوداگری تو ہے، مگر کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی دنیا کی عارضیت کو یوں بیان فرمایا: "دنیا آخرت کے مقابلے میں اس طرح ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈالے، پھر دیکھے کہ وہ اس کے ساتھ کیا لے کر آتی ہے"۔[۳۹] شیخ العالم کی نصیحت دراصل اسی نبوی تنبیہ کی شرح ہے کہ دنیا کی فانی زیب وزینت میں الجھنا محض دھوکا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

سَتھ چھم چانی پَتھ چھم نہ کانہہ نَے کر تام بدریم دیہہ تہ دودریم دات[۴۰]

---

[۳۶] القرآن، سورہ آل عمران:۱۸۵۔

[۳۷] القرآن، سورہ حدید:۲۰۔

[۳۸] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص۳۹؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص۸۴۔

[۳۹] امام ترمذی، سنن ترمذی، حدیث ۲۳۲۳، ص:۲۰۷۔

[۴۰] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص۵۱؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص۸۴۔

(تیرے بغیر میرا کوئی آسرا نہیں۔ کل جب میرا بے کار جسم پیوند خاک ہو کے گل سڑ جائے گا، مجھے تیری ہی مہربانی کی اُمید ہے)

یہ شعر اللہ تعالیٰ پر کامل توکل اور اخروی امید کا پیغام دیتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے: "مومنوں کو تو اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ کرنا چاہیئے"۔[۴۱] انسان کے مرنے کے بعد کوئی رشتہ، کوئی مال اور کوئی مرتبہ اُس کے ساتھ نہیں جاتا، صرف اللہ کی رحمت اُس کا سہارا بنتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعا میں واضح فرمایا: "یا اللہ آنکھ جھپکنے کے برابر بھی مجھے اپنے آپ کے سپرد مت کرنا"۔[۴۲]

تمام مسائل کا حل: شیخ العالم کے نزدیک انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل اور سماجی و روحانی بحرانوں کا واحد اور دائمی حل اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنی فکری و عملی وابستگی کو خالصتاً قرآن، سنتِ نبوی ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کی تعلیمات کے ساتھ استوار کرے۔ اُن کے کلام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف فرد کی نجات بلکہ معاشرتی بقا اور تہذیبی استحکام کو بھی اسی اصول سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک کوئی بھی فرد یا جماعت اُس وقت تک حق کے راستے پر نہیں چل سکتی جب تک کہ وہ نبی کریم ﷺ کو اپنا مرشدِ کامل اور خلفائے راشدین کو اپنے عملی رہنما نہ بنائے۔ اس طرح شیخ العالم مسائل کے حل کو محض فلسفیانہ یا مجرد تصورات میں نہیں دیکھتے بلکہ ایک واضح عملی ماڈل تجویز کرتے ہیں، جس کی بنیاد وحی، سنت اور سلف صالحین کی پیروی پر قائم ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

محمد تہ ثور یار برحق گنزُ کھ تمَن نِشہ اند نَے ساری نِیاے
مال و جان پنُنے تہنزِ وتہِ بنزُ کھ سوے چھے تور کِژ بڑ رہکاے[۴۳]

(حضرت محمد ﷺ اور اُن سے تربیت یافتہ چاروں خلفائے راشدین کو برحق جان لو۔ ان کے پاس تمہارے دین و دنیا کے سارے معاملات اور مسائل حل ہونگے۔ اپنا مال اور جان اُن ہی کی پیروی میں خرچ کرو۔ یہ عقبیٰ میں تمہارے لئے بہت بڑا سرمایہ (نجات) ثابت ہو گا۔ اندھا

---

[۴۱] القرآن، سورہ آل عمران: ۱۲۲۔

[۴۲] امام ابو داؤد، سنن ابو داؤد، حدیث ۵۰۹۰،، ص: ۸۱۰۔۸۱۱۔

[۴۳] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۷۵؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۹۵۔

آگے چلنے کے لئے لاٹھی کا محتاج ہے۔ اسی طرح دین حق کو سمجھنے کے لئے تم بھی محتاج ہو۔ تم اپنا پاؤں آگے نہیں بڑھا سکتے ہو جب تک کہ تم رسول برحق ﷺ اور خلفائے راشدین کو اپنا رہنما نہ بناؤ گے)

یہ شعر دراصل شیخ العالم کے نظریات کا خلاصہ ہے۔ اُنہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ اور خلفائے راشدین کی اطاعت کو زندگی کے تمام مسائل کے حل کی بنیاد قرار دیا۔ قرآن بھی اسی اصول کو بیان کرتا ہے: "اگر کسی چیز میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ"۔[۴۴] یہ آیت براہِ راست اس بات کی تائید کرتی ہے کہ اصل فیصلہ کن اتھارٹی اللہ کی کتاب اور نبی اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ خلفائے راشدین کی پیروی بھی اسی دائرے میں آتی ہے کیونکہ وہ براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تربیت کے پروردہ اور قرآن و سنت کے عملی مظہر تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنی امت کو خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھامنے کی نصیحت کی ہے: "تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو، اور اسے دانتوں سے مضبوطی سے تھام لو"۔[۴۵] شیخ العالم نے اس حدیث کے مضمون کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ دنیاوی و اخروی نجات اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنی جان و مال کو رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کی سنت کے مطابق صرف کرے۔ اندھے اور لاٹھی کی مثال نہایت بلیغ استعارہ ہے، جس سے وہ یہ سمجھاتے ہیں کہ جس طرح اندھا اپنی لاٹھی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتا، اسی طرح انسان بھی قرآن، رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کی پیروی کے بغیر فکری و عملی اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا۔ تاریخی تناظر میں شیخ العالم نے کشمیر میں رسول اللہ اور خلفائے راشدین کی تعلیمات کو عام کیا، جو دینی اور سماجی اصلاح کا باعث بنا۔ موجودہ دور میں جہاں فکری، اخلاقی، اور معاشی مسائل نے کشمیری معاشرے کو کمزور کیا ہے، یہ پیغام تمام مسائل کے حل کے لیے ایک جامع رہنما اصول ہے۔ یہ تعلیم دینی اقدار کی بحالی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

کشمیری وادی کی روحانی اور ثقافتی شناخت صدیوں سے اس کی سماجی ہم آہنگی اور فکری گہرائی کی گواہ رہی ہے۔ اس شناخت کو تشکیل دینے میں شیخ العالم کی تعلیمات ایک عظیم رہنما کے طور پر

---

[۴۴] القرآن، سورہ نساء:۵۹۔

[۴۵] امام ابوداؤد، سنن ابوداؤد، حدیث ۴۶۰۷، ص:۵۰۶۔۵۰۷۔

ابھرتی ہیں، جو انسان کو اس کے وجود کے مقصد اور سماجی ذمے داریوں سے آگاہ کرتی ہیں۔ ان کا کلام ایک ایسی آفاقی حکمت پیش کرتا ہے جو موجودہ دور کے کشمیری معاشرے کے لیے بھی ایک روشن مینار ہے۔ یہ تعلیمات نہ صرف انفرادی کردار کی تعمیر کرتی ہیں بلکہ ایک ایسی سماجی ترتیب کی طرف رہنمائی کرتی ہیں جو انصاف، محبت، اور باہمی احترام پر مبنی ہو۔ موجودہ دور میں جب کشمیری معاشرہ عالمگیریت اور سماجی تبدیلیوں کے دباؤ سے گزر رہا ہے، شیخ العالم کی تعلیمات ایک ایسی روشنی ہیں جو نئی نسل کو اپنی جڑوں سے جوڑتی ہیں۔ یہ تعلیمات انسان کو اپنی اندرونی طاقت سے روشناس کراتی ہیں، اور ایک ایسی زندگی کی طرف بلاتی ہیں جو معنویت اور مقصد سے بھرپور ہو۔ یہ نہ تو دنیا سے کنارہ کشی کی دعوت دیتی ہیں اور نہ ہی مادیت کی اندھی دوڑ کی ترغیب، بلکہ ایک متوازن راہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو روحانی اور سماجی ذمہ داریوں کو ہم آہنگ کرتی ہے۔ شیخ العالم کی حکمت کشمیری معاشرے کے لیے ایک امید کی کرن ہے، جو اسے اپنی تاریخی میراث سے جوڑتے ہوئے ایک روشن مستقبل کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ تعلیمات نئی نسل کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ اپنی ثقافتی اور روحانی جڑوں کو مضبوط کریں، اور ایک ایسا سماج تشکیل دیں جو انسانیت کی خدمت اور فکری بیداری پر مبنی ہو۔ یہ پیغام آج بھی زندہ ہے، اور ہر اس شخص کے لیے ایک رہنما ہے جو اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد کے لیے وقف کرنا چاہتا ہے۔

مصادر و مراجع

۱۔ اسد اللہ آفاقی، کلیات شیخ العالم، لائف فاؤنڈیشن، چرار شریف، 2008۔

۲۔ امام ابو عبد اللہ محمد اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، ترجمہ: وحید الزماں، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰۔

۳۔ ام ام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابو داؤد، ترجمہ: ابو عمار عمر فاروق سعیدی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء۔

۴۔ امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، جامع سنن ترمذی، تحقیق: محمد ناصر الدین البانی، ترجمہ: علی مرتضیٰ طاہر، دار العلم، ممبئی، ۲۰۱۹۔

۵۔ جی ایم شاد، کلامِ شیخ العالم، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۳۔

6. "Dropout rate in J&K Declines at Primary level but worsens at secondary stage: Centre," Kashmir Life, June 26, 2025 - https://kashmirlife.net/over-13-5-lakh-battle-drug-abuse-in-jk-1-6-lakh-aged-10-17-395187 /

7. "Over 13.5 Lakh Battle Drug Abuse in JK, 1.6 Lakh Aged 10–17," Kashmir News Service, July 21, 2025 - https://knskashmir.com/dropout-rate-in-jandk-declines-at-primary-level-but-worsens-at-secondary-stage--centre-196562

منشی پریم چند کی کہانیوں کے عربی تراجم

پروفیسر حبیب اللہ خان
شعبہ عربی وڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ
habibkhan2863@gmail.com

دنیا کے ملک ہمیشہ سے سرحدوں میں بٹے رہے ہیں، مگر زبان و ادب کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ جب ادب واقعی اعلیٰ اور بامعنی ہو تو وہ جغرافیہ، ثقافت اور سیاست کی قیود سے بالاتر ہو کر انسانوں کو مشترکہ تجربات کی بنیاد پر ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ بڑا ادب دل کی آواز بنتا ہے-وہ انسانی جذبات، جدوجہد، امیدوں اور اقدار کی عکاسی کرتا ہے جسے ہر دور اور ہر خطے میں یکساں طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا ادب دنیا کی تمام سرحدوں کو عبور کر کے ہر جگہ قارئین کے دلوں میں اپنی جگہ بنالیتا ہے۔

اس سے پہلے کہ پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں کے عربی تراجم پر تفصیلی گفتگو کی جائے، مناسب ہو گا کہ عربی زبان کی اہمیت اور اس کے تاریخی پس منظر پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے۔ جیسا کہ سب بخوبی واقف ہیں کہ عربی زبان قرونِ وسطیٰ میں ترجموں کی بدولت دنیا کی ان زبانوں کی صف میں جا کھڑی ہوئی جنھوں نے اپنے عروج کے زمانے میں اپنے وقت کی انسانی تہذیب کا بیش بہا ثقافتی ورثہ اپنے دامن میں سمیٹ کر نہ صرف اسے محفوظ کیا بلکہ اسے سنوار کر اور ترقی دے کر پوری انسانیت کے لیے قابلِ استفادہ بنایا۔ ان زبانوں میں سنسکرت، قدیم چینی زبان، یونانی اور لاطینی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں، جنھوں نے مختلف ادوار میں علم و حکمت کے فروغ اور انسانی فکر کی آبیاری میں بنیادی کردار ادا کیا۔

پریم چند کی تحریریں اس حقیقت کی روشن مثال ہیں۔ ان کی کہانیاں اگرچہ ہندوستانی معاشرے کی گہرائیوں سے جڑی ہوئی ہیں، مگر ان میں پیش کیے گئے موضوعات، جیسے غربت، انصاف، انسانی وقار اور سماجی اصلاح، کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہیں۔ یہ مسائل اور احساسات دنیا بھر کے انسانوں کے لیے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریریں مختلف ثقافتوں

اور مختلف پس منظر رکھنے والے قارئین کے دلوں کو چھو لیتی ہیں۔ ان کی سادگی، حقیقت پسندی اور فکری گہرائی انھیں عالمی ادب میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔

انہی اسباب کی وجہ سے پریم چند کی نگارشات ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کر کے عالمِ عرب میں پہنچیں، جہاں مصر اور شام جیسے ملکوں میں ان کی تخلیقات کا ترجمہ کیا گیا اور انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مؤثر کہانی کا انحصار صرف زبان پر نہیں ہوتا، بلکہ ان جذبات اور خیالات پر ہوتا ہے جو وہ اپنے اندر سموئے رہتی ہے۔ پریم چند کی تخلیقات آج بھی مختلف ثقافتوں کے درمیان ایک مضبوط پل کا کام کرتی ہیں اور ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ قومیں سرحدوں سے تقسیم تو ہو سکتی ہیں مگر ادب کے حوالے سے انسانیت ہمیشہ ایک رہتی ہے۔

عربی میں ایک مشہور مقولہ ہے: "لو لم تكن الترجمة العربية لضاعت حكمة اليونان" جس کا مطلب ہے: "اگر عربی ترجمہ نہ ہوتا یعنی اگر عربوں نے ترجمہ نہ کیا ہوتا تو یونان کی ساری حکمت وفلسفہ ضائع ہو گیا ہوتا"۔ [1]

عربوں نے صرف یونانی کتابوں کے ترجمے نہیں کیے، بلکہ بغداد میں جب خلیفہ مامون الرشید نے سنہ ۸۳۰ء میں بیت الحکمہ قائم کیا تو اس میں یونانی، سریانی، فارسی، سنسکرت اور دیگر زبانوں سے عربی میں نہایت وسیع پیمانے پر علمی سرمایے کو منتقل کیا گیا۔ اس عظیم علمی مہم میں شریک مترجمین اور علما کی بڑی تعداد یہودی، عیسائی اور دیگر مذاہب سے وابستہ اہلِ علم پر مشتمل تھی۔

جہاں تک ہندوستانی کتابوں کے ترجموں کا سوال ہے تو باوجود یکہ ہند و عرب کے باہمی روابط کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے، تاہم دستیاب تحقیقی مواد کے مطابق ہندوستانی علمی تصانیف کا باقاعدہ تحریری ترجمہ: سنہ ۷۷۱ء میں سامنے آیا۔ [2] یہ عہد خلیفہ ابو جعفر المنصور کا تھا، جو علمِ نجوم اور فلکیات کی کتابوں کے تراجم میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سنہ ۷۷۱ء میں سندھ سے ہندوستانی علما کا ایک وفد خلیفہ ابو جعفر المنصور کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس وفد میں ایک ممتاز عالم بھی شامل تھا جس کا نام غالباً 'گنگا' تھا۔ اس کو عربی مصادر میں 'کنکا' کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ریاضیات اور علمِ فلکیات میں غیر معمولی مہارت رکھتا

---

[1] ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ، البیان والتبیان، شرکۃ القدس للنشر والتوزیع، القاہرۃ، ۲۰۱۳ء، ص: ۴۰۔

[2] مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ہندوستان عربوں کی نظر میں (جلد: ۱)، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص ۲-۳۔

تھا۔ اس نے خلیفہ کی خدمت میں فلکیات پر ''سوریاسدھانت'' نامی کتاب پیش کی۔ خلیفہ المنصور نے اس کتاب کی اہمیت کے مدِّنظر اس کا عربی ترجمہ معروف ماہرِ نجوم ابراہیم بن حبیب الفزاری سے کروایا، جو ہندوستانی زبانوں پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ عربی میں یہ کتاب ''زیج السند ہند'' یا ''زیج السند ھند الکبیر'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس ہندوستانی عالم کے پاس دیگر کتابیں بھی تھیں، جن کا ذکر عربی مصادر میں ''الجبر'' اور ''الارکند'' کے ناموں سے ملتا ہے۔[۳]

اسی دور میں عربی کے نامور ادیب عبد اللہ بن المقفع (م: ۱۴۲ھ / ۷۵۹ء) نے سنسکرت کے عظیم ادبی شاہکار ''پنچ تنتر'' کو پہلوی زبان سے عربی میں کلیلہ و دمنہ کے نام سے ترجمہ کیا جو آج بھی مقبول ہے۔ بعد ازاں ابان بن عبد الحمید اللاحقی (م: ۲۰۰ھ / ۸۱۵ء تقریباً) اور علی بن داؤد (م: ۲۳۰ھ تقریباً) جیسے جلیل القدر اہلِ علم نے اس کا منظوم ترجمہ عربی زبان میں کیا۔ مزید برآں، عربوں نے ہندوستان کی ایک اور شہرۂ آفاق تصنیف: ''ہزار داستان'' یا ''ہزار افسانے'' کو عربی میں ''الف لیلۃ ولیلۃ'' کے عنوان سے منتقل کیا، جو آج دنیا بھر میں *Arabian Nights* کے نام سے مشہور ہے۔

یہ کہنا درست ہو گا کہ برِّصغیر کے دو عظیم ادبی شہ پارے محض اپنے عربی تراجم کے وسیلے سے عالم گیر شہرت کے حامل ہوئے۔ یہ شاہکار ''پنچ تنتر'' اور ''ہزار افسانے'' ہیں۔ ان کے عربی قالب نے وہ ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی ہے کہ اس کے بعد یہ تصانیف دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں منتقل ہو کر بین الاقوامی ادبیات کا حصہ بن گئیں۔

زمانہ برق رفتاری سے گزرتا رہا اور اسی کے ساتھ ساتھ ترجمے کی تحریک بھی دن بہ دن آگے بڑھتی گئی۔ ہندوستان کی اہم و ممتاز شخصیات جیسے علامہ محمد اقبال، مہاتما گاندھی، رابندر ناتھ ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ کی علمی و ادبی نگارشات کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اس امر کے خواہاں تھے کہ برِّصغیر کی عظیم تہذیبی و ادبی میراث کو عالمی سطح پر متعارف کرایا جائے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے ہندو مت کے دو عظیم رزمیے ''رامائن'' اور ''مہابھارت''، کا جدید عربی زبان میں ترجمہ کرانے کا منصوبہ بنایا تاکہ عرب دنیا بھی ان لازوال داستانوں کے فکری و تہذیبی متن سے بہرہ مند ہو سکے۔ اس

---

[۳] مأخذ سابق، ص ۴-۷۔

اہم علمی خدمت کے لیے مولانا آزاد نے لبنان کے نامور شاعر، ادیب اور مترجم ودیع البستانی کا انتخاب کیا، جو عربی زبان وادب پر گہری دسترس رکھتے تھے اور ترجمہ نگاری میں غیر معمولی مہارت بھی۔ ودیع البستانی نے اس ذمہ داری کو نہایت سنجیدگی اور محنت کے ساتھ نبھایا اور ان عظیم رزمیوں کو عربی قالب میں ڈھال کر ایک ایسا ادبی شاہ کار پیش کیا جو مشرقی تہذیبوں کے مابین فکری وثقافتی روابط کا ایک روشن سنگِ میل ثابت ہوا۔

ایک طویل وقفہ سکوت کے بعد، سنہ ۲۰۰۹ء میں ابو ظبی کی اتھارٹی برائے ثقافت و ورثہ (ADACH) نے اس حقیقت کا از سرِ نو ادراک کیا کہ جس طرح قدیم ہندوستانی علوم وفنون کو عربی قالب میں منتقل کیا تھا، اسی طرح عہدِ حاضر کی ہندوستانی علمی، فکری اور تہذیبی تخلیقات کو بھی عرب دنیا تک پہنچانا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، تاکہ جدید ہندوستان کے فکری مباحث، سماجی رویّے اور تہذیبی جہات سے عرب دنیا کے اہلِ علم ودانش کو آگاہی ہو اور باہمی فکری تبادلے مستحکم ہوں۔

اسی اعلیٰ مقصد کے پیشِ نظر اس ادارے نے اس اہم علمی منصوبے کی ذمہ داری 'کلمہ' (KALIMA) کے سپرد کی، جو ترجمہ واشاعت کے میدان میں ایک ممتاز اور فعال ادارہ ہے۔ کلمہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انڈیا-عرب کلچرل سینٹر کے اشتراک سے نہایت غور وفکر کے بعد ہندوستان کے نامور اہلِ قلم اور مفکرین کی دس نمائندہ کتابوں کا انتخاب کیا، جو اپنے اپنے موضوعات کے اعتبار سے یکتائے روزگار ہیں۔

ان منتخب کتب میں نوبل انعام یافتہ ماہرِ معاشیات امریتہ سین کی فکر انگیز تصنیف *The Argumentative Indian* شامل ہے، جو ہندوستانی تہذیب میں مکالمے اور استدلال کی روایت کو اجاگر کرتی ہے۔ اسی طرح ایم. جے. اکبر کی *The Shade of Swords: Jihad and the Conflict between Islam and Christianity* بین المذاہب تعلقات اور تاریخی کشمکش کا بصیرت افروز جائزہ پیش کرتی ہے۔ پروفیسر مشیر الحسن کی کتاب *Moderate or Militant: Images of India's Muslims* بھی ان میں شامل ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف تعبیرات اور سماجی رویّوں کا عالمانہ مطالعہ ہے، جب کہ پوَن کے. ورما کی *Being Indian* ہندوستانی شناخت اور تہذیبی شعور کی پرتیں کھولتی ہے۔ ان کے علاوہ ششی تھرور کی *Nehru: The*

Invention of India جدید ہندوستان کی تشکیل میں جواہر لال نہرو کے کردار کو دل نشیں اسلوب میں پیش کرتی ہے۔

یہ تمام تصنیفیں نہ صرف جدید ہندوستان کے فکری، سماجی اور تہذیبی منظرنامے کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ عرب دنیا کے قارئین کے لیے ایک ایسا دریچہ بھی کھولتی ہیں جس کے ذریعے وہ ہندوستانی معاشرے کی فکری جہات اور اس کے تہذیبی تنوع کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اس طرح یہ ترجمے کا عمل محض لسانی منتقلی نہیں بلکہ تہذیبوں کے درمیان ایک بامعنی مکالمے اور فکری ہم آہنگی کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ پریم چند برِّصغیر کے ان عظیم ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے قلم کی بدولت نہ صرف ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کی بلکہ انسانی زندگی کے آفاقی مسائل کو ایسی سادگی اور صداقت کے ساتھ پیش کیا کہ وہ سرحدوں سے ماوراہو گئے۔ ان کی تحریروں میں زندگی کی تلخ حقیقتیں، معاشرتی ناانصافیاں، طبقاتی کشمکش اور انسانی ہمدردی اس انداز میں نمایاں ہوتی ہے کہ ہر قاری خود کو ان کہانیوں کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

عرب دنیا میں پریم چند کا تعارف دراصل اسی عالمی انسانیت کے رشتے کا تسلسل ہے، جس کا ذکر شروع کے صفحات میں کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں، ناولوں اور دیگر تحریروں کے عربی ترجموں نے وہاں کے اہلِ علم وادب کو نہ صرف ہندوستانی سماج سے روشناس کرایا بلکہ اس بات کو بھی واضح کیا کہ انسانی دکھ، جدوجہد اور امیدیں کسی ایک قوم یا خطے کی میراث نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کی تحریریں عرب دنیا میں اسی طرح مقبول ہوئیں، جس طرح کہ برّصغیر میں۔ جہاں تک میری نظر جاتی ہے عالمِ عرب میں پریم چند کا تعارف بنیادی طور پر سات اہم ذرائع سے ہوا۔ ان ذرائع نے نہایت خاموش مگر بہت ہی مؤثر انداز میں ہندوستانی ادب کو عرب قارئین تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

پہلا ذریعہ حکومتِ ہند کی سرپرستی میں شائع ہونے والے وہ رسائل ومجلات ہیں، جن کا بنیادی مقصد عرب دنیا کو ہندوستانی تہذیب وثقافت سے روشناس کرانا ہے۔ ان میں سرِفہرست مجلہ ”ثقافۃ الہند“ ہے، جس کے صفحات پر وقتاً فوقتاً ہندوستانی ادب کے مختلف پہلو، منتخب کہانیاں اور

پریم چند سمیت ممتاز قصہ نویسوں کی تخلیقات عربی ترجمے کی صورت میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس مجلے نے عرب دنیا کو ہندوستانی معاشرت اور اس کے ادبی سرمایے سے متعارف کرانے میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

اسی مجلے میں بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں محی الدین الالوائی نے ہندوستان کی مختلف زبانوں تمل، تیلگو، کنڑ، ملیالم، آسامی، بنگالی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، ہندی، اردو اور انگریزی میں لکھی گئی کہانیوں کے ترجمے شائع کیے ہیں جس میں پریم چند کی کہانیاں بھی شامل ہیں[۴]۔ مجلہ ''ثقافۃ الہند'' میں پریم چند کی پہلی کہانی ''نداء الایمان'' کے عنوان سے ستمبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی، دوسری کہانی ''الطفل'' کے عنوان سے جولائی ۱۹۷۲ء میں۔ پھر ایک مضمون ''بریم تشاند وورشتہ'' کے عنوان سے ۱۹۷۸[۵] میں چھپا اور پھر ایک مبسوط مقالہ: ''بیئۃ بریم تشاند'' کے عنوان سے ۱۹۸۲ء[۶] میں اور پھر کہانی ''الکفن'' کے عنوان سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔

دوسرا اہم ذریعہ مصر سے شائع ہونے والا مجلہ ''صوت الشرق'' ہے جو ہندوستانی سفارت خانے کے شعبۂ اطلاعات سے ۱۹۵۲ سے شائع ہوتا آرہا ہے۔ اس مجلے کے توسط سے مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستانی ثقافت اور ادب کو عرب قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصر کے ممتاز ادیب، بالخصوص یحییٰ حقی کا کردار قابلِ ذکر ہے۔ یحییٰ حقی وہ مصری ادیب ہیں جنھوں نے رویندر ناتھ ٹیگور کی متعدد کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستانی سفارت خانے کی ادبی سرگرمیوں میں شریک ہوتے تھے بلکہ وہاں مقیم ہندوستانی طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے کہ وہ اپنے ادب اور ثقافت کو عربی زبان میں پیش کر سکیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، جنھوں نے غالب کے منتخب اشعار کا عربی ترجمہ پیش کیا اور یحییٰ حقی کی رہنمائی میں یہ کوشش ایک باقاعدہ ادبی سفر میں ڈھل گئی۔

تیسرا ذریعہ شام سے شائع ہونے والا مجلہ ''الہند'' ہے جو ہندوستانی سفارت خانے کے

---

[۴] کشاف مجلہ: ثقافۃ الہند، پروفیسر سید حسنین اختر (۱۹۵۰-۱۹۹۰ء) مولانا محمد عبادت ایجوکیشنل سوسائٹی، امروہہ، ۲۰۱۴ء، ص: ۶۰۔

[۵] مجلہ: ثقافۃ الہند (جلد: ۲۹، شمارہ: ۱)، آر کے سہانی، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، نئی دلّی، ۱۹۸۷ء، ص: ۲۴۔

[۶] مجلہ: ثقافۃ الہند (جلد: ۳۳، شمارہ: ۱)، اقبال سنگھ، ۱۹۸۲ء، ص: ۲۸۔

زیرِ اہتمام شائع ہوتا تھا۔ اس مجلے میں ہندوستان کی سائنسی ترقی، تہذیبی تنوع، ادبی روایت، اور ممتاز شعرا و ادبا بشمول پریم چند کا تعارف تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے۔ دیگر مجلّوں کی طرح یہ مجلہ بھی عرب دنیا میں ہندوستانی ادب کے فروغ کا ایک مؤثر وسیلہ ثابت ہوا۔

چوتھا معتبر ذریعہ اُن جلیل القدر اہلِ علم و ادب کی خدمات ہیں جو جامعہ ازہر (قاہرہ) کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہیں اور جنھوں نے خلوص و محنت کے ساتھ اردو ادب کو عربی دنیا سے متعارف کرانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس معاملے میں خصوصاً پروفیسر احمد محمد عبد الرحمن القاضی، ڈاکٹر رانیا محمد فوزی اور پروفیسر یوسف عامر کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر رانیا محمد فوزی کی علمی کاوش ایک درخشاں مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے پریم چند کے شہرۂ آفاق ناول: ''گئودان'' کو عربی زبان میں ''القربان'' کے عنوان سے منتقل کیا۔ یہ ترجمہ المرکز القومی للترجمۃ (قاہرہ) سے ۲۰۰۸ء میں ایک ضخیم جلد کی صورت میں شائع ہوا، جو ۶۷۷ صفحات پر مشتمل ہے[۷]۔ یہ ایک ایسا شاہکار ہے جو محض ترجمہ نہیں بلکہ تہذیبی مکالمے کا ایک سنجیدہ مظہر ہے۔

اس ترجمے کو مزید وقعت پروفیسر احمد محمد عبد الرحمن القاضی کی علمی نظر نے عطا کی۔ انہوں نے اس کی باریک بینی سے نظرِ ثانی کی اور ایک مبسوط و بصیرت افروز مقدمہ تحریر کیا۔ اس مقدمے میں انھوں نے پریم چند کے عہد کے سماجی و تہذیبی پس منظر، ان کی ادبی جدوجہد اور ان کے ناولوں کی فکری جہات کو گہرائی اور توازن کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے قاری کو متن کے ساتھ اس کے پس منظر تک رسائی بھی فراہم کی ہے۔

اسی طرح پروفیسر یوسف عامر (مصری)، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک سابق طالب علم اور جامعہ ازہر کے موجودہ پرووائس چانسلر، نے بھی اپنی علمی سرگرمیوں کے توسط سے ایک اہم خلا کو پُر کیا ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تحریروں اور کئی جلدوں پر مشتمل سیرت النبی، کو عربی زبان میں منتقل کر کے ایک ایسی خدمت انجام دی جو علمی اور روحانی دونوں حوالوں سے نہایت اہمیت رکھتی ہے۔

درحقیقت جامعہ اَزہر کے شعبۂ اردو کے اساتذہ کی مجموعی خدمات ایک روشن روایت کی آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اردو ادب کو عرب قارئین تک پہنچایا بلکہ خود اردو زبان میں بھی

---

[۷] پروفیسر رانیا محمد فوزی، القربان، المرکز القومی للترجمہ، قاہرہ، ۲۰۰۸ء۔

قابلِ قدر علمی و تحقیقی سرمایہ فراہم کیا ہے۔ ان کی یہ سعی و عمل ایک ایسے ثقافتی پل کی صورت اختیار کر گئی ہے کہ جس کے تعلق سے ہندوستانی تہذیب و ادب کی مہک مصر کی سرزمین تک پہنچ گئی ہے۔

پانچواں اہم ذریعہ ہندوستان کی ساہتیہ اکیڈمی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے دورِ صدارت میں ساہتیہ اکیڈمی نے شام کے "اتحاد الکُتّاب العرب" یعنی ایسوسی ایشن آف عرب رائٹرز کے ساتھ ایک میمورنڈم آف انڈراسٹینڈنگ پر دستخط کیا۔ اس معاہدے کا مقصد دونوں ملکوں کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے درمیان ادبی روابط کو فروغ دینا اور ایک دوسرے کی تخلیقات کو دنیا سے روشناس کرانا تھا۔ اس معاہدے کے تحت ہر سال شام سے ادیبوں کا ایک وفد ہندوستان آتا تھا، اور یہ وفد جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے علمی و ادبی مرکز کی زیارت بھی کرتا تھا۔ اسی معاہدے کے تحت ساہتیہ اکیڈمی کی مرتب کردہ کتاب "ہندوستانی کہانیوں کا مجموعہ" جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور جس میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے نمایاں قصہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں، کا ترجمہ عربی میں شامی ادیبوں نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا[۸]۔ اس میں پریم چند کی شہرہ آفاق کہانی "کفن" بھی شامل ہے یہ ترجمہ نہ صرف شام بلکہ پورے عالمِ عرب کے علمی حلقوں میں وسیع پیمانے پر مقبول ہوا، اور اہلِ علم نے اس کی بھرپور پذیرائی کی۔

اسی طرح جب ہندوستانی ادیبوں کا وفد شام گیا تو ہندوستان کے اہلِ قلم کی نگارشات اور معروف شعرا کے کلام کو عربی میں ترجمہ کروا کے کتابی شکل میں شام لے گیا۔ اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان ادب کے ایک خوبصورت اور بامعنی تبادلے کا آغاز ہوا، جس نے باہمی فہم وادراک کو مضبوط کرنے میں عمدہ کردار ادا کیا۔ یہ خوش آیند سلسلہ کم و بیش تین چار برس تک جاری رہا، لیکن بعد میں شام کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔ یہ روایت اس حقیقت کی واضح مثال ہے کہ ادب زبانوں اور سرحدوں کی قید سے آزاد ہو کر دلوں کو جوڑنے کی طاقت رکھتا ہے، اگرچہ سیاسی حالات کبھی کبھی اس کے تسلسل میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

چھٹا اہم ذریعہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں ہیں، خصوصاً شعبۂ عربی میں انجام پانے والے تحقیقی مقالات، جنھوں نے پریم چند کے تعارف اور فہم کو علمی سطح پر مستحکم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان تحقیقی سرگرمیوں میں ریسرچ اسکالرز نے پریم چند کا تقابلی مطالعہ عرب دنیا کے

[۸] ہدی الکیلانی و ڈاکٹر ابراہیم الشہابی، قصص ہندیۃ، اتحاد الکتّاب العرب، دمشق، ۲۰۰۵ء، کل صفحات ۷۸۳۔

ممتاز ادیبوں کے ساتھ کیا ہے، جس کے توسط سے نہ صرف ان کی ادبی تخلیقات منظرِ عام پر آئیں بلکہ دونوں تہذیبوں کے درمیان فکری مماثلتیں اور امتیازات بھی واضح ہوئے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر جسیم الدین نے دلّی یونیورسٹی سے پریم چند کا تقابلی مطالعہ عبد الرحمن الشرقاوی کے ساتھ کیا ہے، جو مصر کے ممتاز ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ مقالہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اہم علمی کارنامہ ہے، جس میں دونوں ادیبوں کے فکری اور سماجی رجحانات کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ مزید برآں، اس موضوع پر جامعہ ملیہ کے شعبۂ عربی کے پروفیسر فوزان احمد نے ایک جامع اور مبسوط مقالہ عالمی اردو کانفرنس میں پیش کیا، جس میں ان تحقیقی سرگرمیوں کا بھرپور احاطہ کیا گیا۔

ساتواں اہم ذریعہ اس ڈیجیٹل دور میں آن لائن شائع ہونے والے عربی جرائد اور مجلات ہیں، جو علم کے بے مثال فروغ کے مظہر ہیں اور جن کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ان مجلات میں سے ہندوستان سے نکلنے والے پانچ مجلات کا ذکر کرنا میں ناگزیر سمجھتا ہوں۔ ان میں مذکورہ مجلے ''اقلام الہند''، قطوف الہند''، ''ہلال الہند'' اور ''التلمیذ'' ہیں۔ مصر کے ایک فاضل ساتھی پروفیسر جلال سعید حفناوی نے پریم چند کا مشہور قصہ ''عید کے دن'' کا عمدہ ترجمہ عربی میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ مجلہ ''قطوف الہند'' میں ۲۰۲۲ء میں شائع ہوا ہے[۹]۔ اسی مجلے میں ہمارے ایک اور فاضل نوجوان ساتھی ڈاکٹر قمر شعبان ندوی کے دو ترجمے ''مظلوم کی فریاد'' اور ''شطرنج کی بازی'' ۲۰۲۲ء میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ترجمے: ''راہِ نجات'' اور ''ٹھاکر کا کنواں'' ۲۰۲۳ء میں اور ''دو بہنیں'' ۲۰۲۴ء میں اور ''بند دروازہ'' اور ''دو بیل'' ۲۰۲۵ء میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر قمر شعبان کے تین ترجمے مجلہ ''اقلام الہند'' میں شائع ہوئے[۱۰]: ''دودھ کی قیمت'' ۲۰۲۲ء میں، ''نمک کا داروغہ'' ۲۰۲۳ء میں اور ''عید کے دن'' ۲۰۲۴ء میں۔ اس کے علاوہ ان کے چار ترجمے مجلہ ''ہلال الہند'' میں شائع ہوئے[۱۱]، جس میں سے ''کفن'' ۲۰۲۲ء میں اور ''پوس کی رات'' ۲۰۲۴ء میں، اور ''پنچایت'' اور ''انقلاب'' ۲۰۲۵ء میں۔ ان کا ایک ترجمہ ''اکسیر'' مجلہ ''التلمیذ'' میں ۲۰۲۵ء میں

---

[۹] مجلہ: قطوف الہند، ISSN: 2583-5130 کے مختلف شمارے یہاں دستیاب ہیں:
https://www.qutoofalhind.com/

[۱۰] مجلہ: اقلام الہند' کے مختلف شمارے یہاں دستیاب ہیں: https://www.aqlamalhind.com

[۱۱] مجلہ: ہلال الہند' ISSN:2582-9254 کے مختلف شمارے یہاں دستیاب ہیں: https://hilalalhind.in

شائع ہوا[۱۲]۔ اس کے علاوہ ان کے دو ترجمے: "بوڑھی کاکی" ۲۰۲۴ء میں، اور "حجِ اکبر" ۲۰۲۵ء میں مجلہ "دی اینالیسس"[۱۳] میں شائع ہوئے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر قمر شعبان کو پریم چند کی ۱۷ کہانیوں کے ترجمے کا امتیاز حاصل ہے۔ یہ یقیناً خاصا بڑا علمی کام ہے جسے عالمِ عرب کبھی فراموش نہیں کر سکتا ہے۔

ان ساتوں ذرائع نے مل کر ایک ایسا ساز گار فکری و ادبی ماحول پیدا کیا جس کے نتیجے میں عرب قارئین نہ صرف پریم چند کے نام سے آشنا ہوئے بلکہ ان کی تخلیقات کے سماجی و فکری پس منظر کو بھی بہتر طور پر سمجھنے لگے۔ عالمِ عرب تیئس ممالک پر مشتمل ہے، اور ہر ملک کے اپنے علمی مراکز اور ذرائعِ ابلاغ ہیں۔ اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ کوئی فرد ان تمام ممالک میں شائع ہونے والے مواد پر مکمل نظر رکھ سکتا ہے۔ اس لیے میرا یہ مختصر مقالہ دراصل اُس وسیع ذخیرۂ تراجم کی محض ایک جھلک ہے جو ہندوستان کی عظیم تہذیبی و ثقافتی روایات سے مأخوذ ہے۔ اس مقالے میں راقم الحروف نے پریم چند کی تخلیقات کے عربی تراجم کے ایک تاریخی داستانی تسلسل اور دستاویزی خاکے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس میدان میں انجام پانے والے علمی و ادبی کارناموں کا ایک اجمالی تعارف سامنے آسکے۔ البتہ ان تراجم کی فنی و ادبی جہات، ان کی قدر و قیمت، اصل متن سے ان کی وفاداری اور ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کے دوران پیش آنے والے لسانی، ثقافتی، اسلوبی اور تہذیبی مسائل کا تنقیدی جائزہ ایک نہایت وسیع اور دقیق موضوع ہے، جو مستقل تحقیق اور ایک الگ مقالے کا متقاضی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ محققین اس پہلو پر توجہ دیں گے۔

---

[۱۲] مجلہ: التلمیذ، ISSN:2394-6628 کے مختلف شمارے، یہاں دستیاب ہیں:
https://tilmeezjournal.in

[۱۳] مجلۃ دي اینالیسس، ISSN: 2583-9985 (Online) –
https://www.talentpublication.info

مسلمانوں میں عصری تعلیم کا رجحان ایک جائزہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حوالے سے

محمد ثاقب

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

Mohdsaqib640@gmail.com

مدارس مسلمانوں کے نظام تعلیم کا آئینہ دار تھے ان کے نظام تعلیم میں مذہب اور سائنس دونوں شامل تھے ان کو دین اور دنیا کا سنگم کہا جاسکتا ہے مدارس کی تعلیم کی خوبی یہ بھی تھی کہ اس میں روحانی تربیت کا خاص مواد شامل تھا لیکن جب مغربی قوموں کا عروج ہوا اور ان کے ذریعے نصاب تعلیم میں تبدیلی لائی گئی تو اس میں درج بالا خصوصیات نہیں تھیں۔ روحانیت سے عاری تعلیم نے امت کے مزاج و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے۔ جدید نصاب تعلیم سے مذہب بیزاری میں خاصا اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں لارڈ میکالے پہلا برطانوی شخص تھا جس نے ۱۸۳۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت خطوں میں نصاب تعلیم کو تبدیل کیا تھا[۱]۔ نصاب تعلیم کا مقصد انگریزوں کے یہاں تعلیم کا فروغ نہیں تھا بلکہ حکومت کے لئے کل پرزے تیار کرنا تھا۔ تبدیلئ نصاب سے اہل وطن کو کوئی فکر لاحق ہوئی یا نہیں مگر مسلمانوں نے اس تبدیلی پر شدید ردّ عمل کا اظہار کیا۔ برطانوی نظام تعلیم اور انگریزی زبان کی تحصیل کی مخالفت دراصل ردعمل تھا[۲]۔ ردعمل کے ضمن میں کئی سوال پیدا ہوئے: مثلاً جدید تعلیمی نظام ملک و معاشرے کے لئے مفید ہے یا نہیں؟ کیا یہ مسلم نظام تعلیم کی جگہ لے سکتا ہے؟ اس تبدیل شدہ نظام کے ملک وملت پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ کیا مسلمانوں کو جدید نظام تعلیم کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے؟ وغیرہ

مسلم قائدین ورہنماؤں اور دانشوروں نے اس پر کافی غور خوض کیا۔ سرسید اور مولانا قاسم

---

(۱) Mahmood, Syed, *History of English, education in India (1781-1893)*, the honorary secretary of the M.A.O College, Aligarh, 1895, p.50

(۲) حوالہ سابق، History of English education in India (1781-1893) , p 48

نانوتوی کی جماعت نے ان سوالوں کے جواب بھی تلاش کرنے کی سعی کی۔ برّصغیر میں جدید و قدیم نظام تعلیم کے سنگم کی تلاش مغربی تعلیمی نصاب کی افادیت کے اعتراف کے ساتھ اس کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی ایک کوشش تھی۔ مسلمانوں نے جدید تعلیم کے فروغ اور قدیم نظام تعلیم کی بقاء کی پالیسی اختیار کی۔ اس پالیسی نے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جدید اور قدیم کے حمایتوں کے درمیان ایک خلیج پیدا ہوئی جو وقت کے ساتھ بڑھتی گئی۔

برّصغیر میں مسلمانوں کے درمیان عصری تعلیم کے فروغ کے لئے سرسید اور ان کے رفقاء نے جانفشانی سے کام کیا اور علی گڑھ میں ایم اے او کالج کی بنیاد رکھی۔ ابتداءً ملت نے عصری تعلیم کے فروغ کی کوششوں کی مخالفت کی اور سرسید اور ان کے رفقاء کو "کافر" تک کہا گیا[۳]۔ اکبر الہ آبادی نے مسلمانوں کے مزاج کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے[۴]

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

چھوڑ کر لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ختم کر ، اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے، کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی ،کلرکی کر، خوشی سے پھول جا[۵]

اس دور میں متعدد مسلم مفکرین اور دانشوروں نے سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی تعلیمی پالیسی پر تنقید کی اور بعض نے واضح طور پر مخالفت کا رویہ بھی اختیار کیا۔ اگرچہ محمڈن اینگلو اورینٹل

[۳] لدھیانوی، مفتی محمد، فتویٰ نصرۃ الابرار، اسلامی تعلیمی ادارہ، فیصل آباد، ۱۸۸۸ء، ص ۴۲۔

[۴] احسان الحق، جناب بھیا (تشریح تبویب و ترتیب)، قطعات و رباعیات اکبر الہ آبادی، بزم کراچی، ۱۹۵۲ء، جلد دوم، ص ۲۲۶۔

[۵] احسان الحق، جلد اول، ص ۲۱۰۔

کالج (بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے قیام میں سرسید کو کئی روشن خیال اور بااثر مسلم شخصیات کی حمایت حاصل رہی، تاہم مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان کی مخالفت کرتا رہا۔ عمومی طور پر محققین کا یہ خیال ہے کہ اس مخالفت کی بنیاد سرسید کی جانب سے انگریزی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش تھی، جسے بعض حلقوں نے دینی تعلیم کے مقابل ایک خطرہ تصور کیا۔ تاہم شیخ محمد اکرام کی رائے اس عمومی تصور سے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک مخالفت کی اصل وجہ انگریزی تعلیم نہیں تھی بلکہ اس کے پس پردہ دیگر مذہبی، سماجی اور فکری عوامل کارفرما تھے جنہیں نظر انداز کرنا تاریخی تجزیے کے اعتبار سے درست نہیں ہوگا۔ شیخ محمد اکرام اپنی معروف کتاب "موج کوثر" میں لکھتے ہیں:

ہماری رائے میں یہ خیال غلط ہے اور علما اور اسلام کے ساتھ صریح بے انصافی ہے۔ تحصیل علم کے بارے میں رسول کریمؐ کا واضح ارشاد ہے: اطلبوا العلم ولو کان بالصین، یعنی علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین میں جانا پڑے۔ اب اگر چین میں بھی، جہاں کے باشندے انگریزوں کی طرح اہل کتاب بھی نہیں، تحصیل علم کی تلقین کی گئی ہے تو انگریزی تعلیم کی کیوں مخالفت ہو؟ اس کے علاوہ جب شاہ عبدالعزیز سے انگریزی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق فتوی لیا گیا تھا تو انھوں بزور کہا: جاؤ، انگریزی کالجوں میں پڑھو اور انگریزی زبان سیکھو۔ شرعاً ہر طرح جائز ہے۔ اب لوگ حیران ہیں کہ جب سرکار کے قائم کیے ہوئے کالجوں میں پڑھنا جائز تھا تو ایک ایسے مدرستہ العلوم کی کیوں مخالفت ہوئی جو مسلمانوں کا جاری کردہ تھا اور جس میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ اس معمّا کو حل کرنے کے لیے ان مضامین اور فتاوی کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سرسید کی مخالفت اور ان کی تکفیر میں شائع ہوئے۔ ان کے پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس لیے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا اور سرسید اپنی کتب اور تہذیب الاخلاق میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جنھیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاوی میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے۔ بلکہ یہی درج ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں اور جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرنا چاہے اس کی اعانت جائز نہیں۔ شروع شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید اپنے مدرسے میں ان عقائد کی تبلیغ کریں گے، جن کا اظہار وہ اپنے رسائل و کتب میں کر رہے تھے۔ سرسید نے ایسا نہیں کیا، لیکن اُن کی تصانیف میں کئی ایسی

باتیں تھیں جن سے مخالف بلکہ موافق بھی بدظن ہو جاتے تھے۔ سرسید نے جب بائیبل کی نامکمل تفسیر لکھی تو نواب محسن الملک کو اس کی عبارت اتنی شاق گزری کہ اس وقت سرسید سے تعارف نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اس کے خلاف سرسید کو ایک طویل خط لکھا اور جب تک ان سے نہ ملے انھیں یقین نہ آتا تھا کہ سرسید قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتے ہیں! اس تفسیر کے بعد سرسید نے دوسری بے احتیاطی الفنسٹن کی کتاب تاریخ ہند کا ترجمہ شائع کرتے وقت کی۔ اس کتاب میں جہاں کہیں مصنف نے رسول اکرمؐ کا ذکر کیا تھا، وہاں آپ کے متعلق العیاذ باللہ پیغمبر باطل کا لفظ لکھا تھا۔ سرسید نے بھی بلا کم وکاست یہ لفظ اسی طرح ترجمے میں لکھ دیا۔ جب کتاب کا یہ حصہ چھپا تو مولوی سمیع اللہ خان اور دوسرے ممبروں نے اس پر اعتراض کیا۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراض بے جا نہ تھا اور مولٰنا حالی بھی اس بارے میں لکھتے ہیں: ''ممکن تھا کہ ترجمے میں باطل کا لفظ نہ لکھا جاتا''۔ ہم ہندوستانی مسلمانوں کی اس روش کو فضول اور مضر قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنے عقائد یا خیالات کے خلاف کچھ بھی سننا گوارا نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینے یا آنکھوں پر پٹی باندھ لینے سے دنیا کی تلخیاں مٹ جائیں گی۔ لیکن انھیں خواہ مخواہ اشتعال دینے میں بھی کوئی مصلحت نہیں۔ مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر مسلمان سرسید کے ولایت جانے سے پہلے ہی ان سے بدظن تھے، لیکن ان کی سب سے زیادہ مخالفت اس وقت ہوئی جب انھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا اور ان خیالات کا اظہار کیا جنھیں عام مسلمان تعلیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے۔ مثلاً طیور محتقہ، اہل کتاب کے کھانے کا جواز، اجنہ کے وجود سے انکار، آسمانوں کے متعلق عام نقطۂ نظر کی تردید، حدیث تشبہ کی صحت سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سرسید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد وخیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ کام انھوں نے خالص اسلامی ہمدردی سے متاثر ہو کر کیا، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان خیالات کی مخالفت لازمی اور قدرتی تھی۔ جن لوگوں نے سرسید کے حالات بغور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت اُن دقیانوسی علمانے کی جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اور سرکارہ انگلشیہ اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے۔ دونوں معزز سرکاری ملازم یعنی مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج۔ حالی نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں، اُن کا منبع انھی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔ اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے

سخت مخالف تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا۔ اس لیے سرسید کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا۔[۶]

سرسید احمد خان اوران کے رفقاء تنقید و مخالفت کی پروا کیے بغیر اپنے مشن میں ہمہ تن مصروف عمل رہے۔ انھوں نے قومی و ملی تعلیم کے فروغ، طلبہ کی ہمہ جہت تربیت اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے انتھک کوششیں جاری رکھیں۔ ان کی تعلیمی پالیسی کا ایک نمایاں پہلو بچوں کی اخلاقی و دینی تربیت پر خصوصی توجہ دینا تھا۔ بالخصوص نماز کی پابندی کو تربیت کے بنیادی اصولوں میں شامل کیا گیا تھا، اگرچہ ان پر برطانوی ایجنٹ، نیچری، کافر، اور مذہب کا باغی جیسے سنگین الزامات عائد کیے گئے[۷]۔ تاہم وہ ان الزامات سے متأثر ہوئے بغیر اپنے نصب العین کی تکمیل میں منہمک رہے۔ ان کی مستقل مزاجی اور اخلاص ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کی زندگی ہی میں ان کا علمی و تعلیمی مشن ثمر آور ہوا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ابتدا میں ان کے مخالفین میں شامل معروف شاعر اکبر الہ آبادی نے بھی ان کی وفات کے بعد ان کے علمی و قومی خدمات کا اعتراف کیا۔ انھوں نے ایک قطعے میں سرسید کی جدوجہد اور خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں[۸]

مسلمانوں میں سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) پہلے آدمی تھے جنھوں نے قومی تعلیم کے تمام پہلوؤں کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ:

کوئی قوم عزت نہیں پاسکتی جب تک تعلیم اس مقدار مناسب سے اس قوم میں رائج نہ ہو۔ اور اس مقدار مناسب کا اندازہ حسب تفصیل ذیل سے ہو سکتا ہے۔ یعنی ضرورت ہے کہ اس قوم میں

---

[۶] اکرام، شیخ محمد، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۹۰ تا ۹۳۔

[۷] سرور، پروفیسر آل احمد، حیات و سیرت، مطالعہ سرسید احمد خاں (مرتب: عبدالحق)، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، ۱۹۸۹ء، ص ۷ اور عبدالحق، سرسید احمد خاں، مطالعہ سرسید احمد خاں (مرتب: عبدالحق)، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۷۔

[۸] احسان الحق، ص ۲۹۵

ایک گروہ معتدبہ اعلیٰ تعلیم کا ایسا پیدا ہو جس میں سے کوئی کسی علم و دست گاہ کامل رکھتا ہو اور اس طرح تمام علوم کے کامل لوگ اس قوم میں موجود ہوں جن کی عقل و فہم اور سعی و کوشش سے علم دین سے روز بروز ترقی ہو اور جن کے نام سے ہماری قوم کو عزت و فخر ہو اور پھر ان لوگوں کی تعداد بھی ایسی ہو جن پر اطلاق الشاذ کالمعدوم کا نہ ہو اس کے بعد ایک بڑا گروہ متوسط درجہ تعلیم کا اس قوم میں ہونا چاہیئے جو عالی مرتبہ مصنفوں کی علمی تصانیف کو نہایت عمدگی سے جانتا ہو اور ہر ایک دقیقہ لاباریک سے باریک اصول سے بخوبی واقف ہو۔ اور تعلیم کے ذریعے سے وہ سب باتیں اپنی قوم کو سکھلا سکتا ہے۔ اس گروہ کی تعداد ایسی ہونی چاہیے کہ بلحاظ قومی تعداد کے مناسب مناسبت رکھتی ہے۔ اس کے بعد ادنیٰ درجہ تعلیم کا ہے مگر اس میں تین قسم کے گروہوں کا ہونا ضروری ہے ایک گروہ ایسا ہو جو کل قوم میں ایک مناسبت معقول رکھتا ہو اور اس نے اس قدر تعلیم پائی ہو کہ خاص اپنے عقل و علم اپنے کاموں کو انجام دے سکے اس کے بعد اس کا دوسرا درجہ ایسے لوگوں کا ہونا چاہیئے کو اپنے دنیاوی کاموں کا انجام کار کر سکتے ہوں اور جو کہ یہ لوگ محض جاہل نہیں ہونے کے تو ضرور ان میں اس قدر علم کی روشنی ہو گی جو ترقی علوم و فنون میں ہر روز ہوتی ہے اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔[۹]

سر سید احمد خان نے صرف تھیوری پیش نہیں کی بلکہ اس کو روبہ عمل لانے کے لئے کوشش بھی کی۔ انہوں نے مراد آباد کی سرزمین پر ایک مدرسہ قائم کیا تھا جہاں انگریزی اور فارسی تعلیم کا اہتمام تھا۔ نیز ۱۸۶۶ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کیا تھا جس کے مقاصد میں انگریزی یا دیگر یورپی زبانوں سے اردو اور فارسی میں کتابوں کا ترجمہ کرنا شامل تھا تاکہ ہندوستانی مسلمان جدید علوم سے بآسانی استفادہ کر سکیں۔ ۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے زیر اہتمام انہوں نے ایک اخبار نکالنا شروع کیا تھا جسے "علی گڑھ گزٹ انسٹیٹیوٹ" کہا جاتا ہے۔ اس اخبار کے ذریعے انگریزوں کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لئے انگریزی تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی تاکہ مسلمانوں کا رجحان جدید اور اعلیٰ تعلیم کی طرف بڑھ سکے اور اس کے لئے "تہذیب الاخلاق" کو بھی ایک اہم ذریعہ بنایا۔

سر سید کی پوری زندگی قوم و ملت کی خدمات سے لبریز ہے۔ انہوں نے اس کے لئے ۱۸۷۵ء

---

[۹] شیروانی، مولانا حبیب الرحمان، سر سید کی تعلیمی جدوجہد، سر سید سید شناسی (مرتب: ڈاکٹر طاہر تونسوی)، الفیصل، لاہور، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۸۲ تا ۸۳۔

میں علی گڑھ میں ایک اسکول قائم کیا جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج رکھا لیکن سرسید اس سے مطمئن نہیں تھے اور وہ اسے یونیورسٹی کا درجہ دلانا چاہتے تھے۔ سرسید کی ہزار کوششوں کے باوجود یہ کام ان کی زندگی میں نہ ہوسکا البتہ ان کی وفات کے بعد ان کا سنہرا خواب ۱۹۲۰ء میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔

سرسید کی تعلیمی تحریک اور فکری نیز تحقیقی روش کو ان کے رفقاء اور ان کے ادارے میں تعلیم پانے والے طلبہ نے آگے بڑھایا۔ ان میں نمایاں نام مولانا محمد علی جوہر اور شبلی نعمانی کا تھا۔ سرسید کے افکار و مقاصد اور تعلیمی تحریک کو انجام تک پہنچانے میں علامہ شبلی کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے نہ صرف شبلی کالج کی بنیاد رکھ کر سرسید کے افکار کو جلا بخشی بلکہ اپنی علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نایاب کتابیں تحریر کیں جن سے مسلمانوں میں نہ صرف تحقیقی شعور پیدا ہوا بلکہ مستشرقین کو جواب بھی دیا گیا۔

شبلی کی علمی لیاقت، ذہانت و فطانت اور افکار کی بالیدگی سے سرسید کافی متاثر تھے۔ لہٰذا انھوں نے عربی زبان و ادب کی تدریس کی آفر کی۔ شبلی نے اس کو قبول کر لیا اور تقریباً سولہ برس بطور معلم وہاں کام کرتے رہے۔ یہاں ان کی شخصیت، فکر و نظر، عادت و اطوار اور تحقیق و جستجو میں کافی تبدیلی آئی۔ علی گڑھ کے علمی ماحول سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا تھا ان کی تحریروں میں آفاقیت یہیں کی مرہون منت ہے۔ فکر و نظر میں منطقیت اور معروضیت، مطالعہ کا سائنٹیفک انداز اور تحریروں کا منفرد معیار و مقام کا سہرا علی گڑھ کو جاتا ہے۔ علمی فکری اور تعلیمی مماثلت اور یکجہتی کی بنا پر وہ ایجوکیشنل کانفرنس سے بھی وابستہ ہوئے۔

سرسید کے افکار، کردار، تعلیم و تربیت کے اصول اور تحریر و تقریر نیز تعلیمی تحریک کو نمایاں طور پر بڑھانے اور نشو و نما کرنے میں مولانا محمد علی جوہر کا نام بھی شامل ہے۔ آپ کا شمار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر (۱۸۸۷-۱۹۳۱) نے ہندوستان میں حریت کا بیج بویا، ہندو مسلم اتحاد کا علم بلند کیا اور خلافت کی بقاء کے لئے تحریک چلائی، نیز قومی اعلیٰ تعلیم کی فضاسازی اور فروغ میں تاریخ ساز اور انقلاب آفریں کارنامہ انجام دیا۔ ان کے اندر قیادت سیادت، حریت، اتحاد اور تعلیم کے فروغ کا جذبہ علی گڑھ میں پروان چڑھا۔ مولانا نے علی گڑھ میں تعلیم و تربیت ضرور حاصل

کی تھی لیکن وہ اسلام کے انقلابی فکر و ذہن کی وجہ سے علی گڑھ کے ذمہ داران کی پالیسی سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت بھی وہ نیشنلسٹ فکر کے حامی تھے۔

آپ نے علی گڑھ کے طلبہ کے سامنے آزاد تعلیمی پالیسی اور نیشنل یونیورسٹی کا خاکہ پیش کیا ان کا خاکہ بہت سے طلبہ کو پسند آیا اور طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے۔ ادارے کی پالیسی سے اختلاف رکھنے والے طلبہ نے درمیان میں تعلیم ترک کر دی۔ انھیں طلبہ کی تعلیمی ضرورت کے سلسلے میں قومی رہنماؤں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو بنیاد رکھی اور بنیاد رکھنے کے لیے شیخ الہند مولانا محمود حسن کو دعوت دی جو قبول کی گئی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے قیام سے آزاد تعلیمی پالیسی پر کار فرما رہی یہاں تک کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک کو آزادی ملی۔ قومی رہنماؤں نے اس کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۳ء میں یو جی سی نے اسے نیم سرکاری ادارے کی حیثیت سے تسلیم کیا اور سنہ ۱۹۸۸ میں ہندوستانی پارلیمنٹ نے ایک ایکٹ کے ذریعے اسے مرکزی جامعہ کا درجہ دیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے قیام سے لے کر اب تک ترقی کے مختلف مراحل طے کیے ہیں۔ اس میں مختلف علوم و فنون اور تحقیق کا معقول بندوبست ہے۔ عالمی سطح پر بھی اس کی ایک شناخت ہے۔ علی برادران نے جس خلوص اور فکر پر اس ادارے کو قائم کیا تھا یہ ادارہ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر رہا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرح برصغیر ہند میں مسلمانوں نے دیگر متعدد اعلیٰ دینی تعلیمی ادارے بھی قائم کیے جنھوں نے ملت اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیمی و فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ ان اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مدرسہ دارالعلوم دیوبند (قیام:۱۸۶۶) اور ندوۃ العلماء لکھنؤ (قیام:۱۸۹۸) کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علمی تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ اسی تسلسل میں مدرسہ فیض عام مئو (قیام:۱۹۰۲ء) اور مدرسہ اشرفیہ مبارک پور (قیام:۱۹۳۹ء) جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ (قیام:۱۹۶۲)، جامعہ دارالسلام، عمر آباد (قیام:۱۹۴۸ء)، مدرسۃ الاصلاح (قیام:۱۹۰۸ء) جیسے ادارے وجود میں آئے۔ انہوں نے دینی علوم کے ساتھ ساتھ منطق، ریاضی، سائنس، انگریزی اور دیگر عصری مضامین کو بھی اپنے نصاب کا حصہ بنایا۔ بعد ازاں جامعہ محمدیہ منصورہ، مالیگاؤں (قیام:۱۹۶۱ء)، مرکز الثقافہ السنیہ، کالی کٹ (قیام:۱۹۷۸ء)،

جامعہ اشاعت العلوم، مہاراشٹرا (قیام: ۱۹۷۹ء)، جامعہ سلفیہ بنارس (قیام: ۱۹۶۷)، اور جامعہ اسلامیہ سنابل نئی دہلی (قیام: ۱۹۸۰)، مرکز المعارف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سینٹر، ممبئی (MMERC) (قیام: ۱۹۹۲ء) وغیرہ جیسے اعلیٰ ادارے دینی و عصری علوم کے امتزاج کا جدید نمونہ بن کر ابھرے۔ یہ ادارے اس سوچ کی عکاسی کرتے ہیں کہ دینی تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیے بغیر مسلم معاشرے کی ہمہ جہت ترقی ممکن نہیں۔ چنانچہ ان اداروں نے تعلیم کے ذریعے مسلم نوجوانوں کو نہ صرف دینی اعتبار سے مستحکم کیا ہے بلکہ جدید علمی میدانوں میں بھی ان کے لیے راہیں ہموار کیں۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ مسلمانوں کی فکری علمی اور سیاسی پستی نے انھیں برصغیر میں اس دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا جہاں ان کی شناخت کا مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس برّصغیر سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان ختم ہو جائے گا اور مسلمان ہندوستان کے لئے قصۂ پارینہ بن جائیں گے۔ ایسے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ملت کے بعض افراد قیادت کے لئے سامنے آئے، انھوں نے مسلمانوں کے ذلت و پستی کا سبب بتایا اور اس کے علاج کے لئے اسکول و کالج نیز مدارس اسلامیہ کے قیام کی جدجہد کی۔ سرسید احمد خان اور مولانا قاسم نانوتوی کی تعلیمی تحریک نے ابھی مسلم ملت میں زندگی کے آثار پیدا کئے ہی تھے اور چند اسکول و کالج اور مدارس کا قیام عمل میں آیا ہی تھا کہ تقسیم ہند کا عظیم سانحہ واقع ہوا۔ یہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندی مسلم ملت کے لئے دوسرا بڑا حادثہ تھا۔ تقسیم ہند نے مسلمانوں کو دوبارہ اسی جگہ لا کھڑا کیا جہاں سے انھوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان جو علمی تعلیمی اور فکری بالیدگی ہوئی تھی وہ پاکستان چلی گئی۔ ہندی مسلم ملت نے دوبارہ علاج اسی نہج پر شروع کیا جس کی تشخیص اسلاف کر گئے تھے۔ آزادی کے بعد بہت سے اسکول و کالج اور مدارس قائم کئے گئے مگر اس وقت مسلمانوں کے سامنے معاشی چیلنج ہے۔ بہر حال مسلمانوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

اخبار علمیہ

فقه النوازل للأقليات المسلمة کی اشاعت

ڈاکٹر محمد یسری ابراہیم کی ایک حالیہ کتاب فقه النوازل للأقليات المسلمة (مسلم اقلیتوں کے عصری مسائل کا فقہی حل) کے عنوان سے منظر عام پر آئی ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان غیر مسلم اکثریتی ممالک اور معاشرے میں رہتے ہوئے اپنی شناخت اور ایمان کو کیسے محفوظ رکھ سکتا ہے؟ انتہاپسندی یا افراط و تفریط کے بغیر عصری مسائل اور چیلنجز سے نمٹنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یہ کتاب ایک عمدہ علمی علاج کے ساتھ ساتھ اسلامی فقہ کے بنیادی اصولوں، اسلامی قانون کے مقاصد اور بدلتے ہوئے حالات میں شرعی تطبیق کے پہلوؤں کو یکجا کرتی ہے۔ اقلیتوں کی عبادات، لین دین، خاندان اور اسلامی طرز سیاست کے اہم مسائل کا حل بھی پیش کرتی ہے۔ اس علمی مطالعہ پر مصنف کو جامعہ الازہر سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل ہوئی ہے۔ وزارت اوقاف و اسلامی امور، ریاست قطر کی طرف سے دو جلدوں میں ۱۲۸۸/ صفحات میں شائع کی گئی ہے۔ ہر محقق اور طالب علم کے لیے یہ ایک اہم علمی حوالہ اور ہر اس شخص کے لیے مفید ہے جو مسلم اقلیتوں سے متعلق عصری حقائق کو سمجھنا چاہتا ہے۔

التيار العلماني الحديث وموقفه من تفسير القرآن الكريم کی طباعت

ڈاکٹر منی محمد بہیّ الدین الشافعی کی اس کتاب "جدید سیکولرزم اور تفسیر قرآن کے باب میں اس کا موقف" میں بتایا گیا ہے کہ جدید سیکولرزم نے قرآن پاک کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ وہ کون سی فکری بنیادیں ہیں جن پر اس نے قرآنی متن کو پڑھنے اور اس کی تشریح کرنے کی کوشش کی؟۔ یہ کتاب آپ کو ایک حساس علمی سفر پر لے جاتی ہے جس سے قرآنی تفسیر میں دور حاضر کے نمایاں سیکولر نقطۂ نظر کے مناہج منکشف ہوتے ہیں۔ یہ ان طریقوں پر ایک دقیق طریقہ کار کے ساتھ بحث کرتی ہے جو صحیح اسلامی قانونی اصولوں کو علمی تنقید سے جوڑتا ہے، خامیوں کو اجاگر کرتا ہے اور کتاب اللہ کو سمجھنے میں روایتی علمی طریقہ کار کی توثیق و تائید کرتا ہے۔ ایک دستاویزی علمی مطالعہ، عصری غلط فہمیوں کی ایک اصولی تنقید، منحرف تشریحات کی فکری جڑوں کا تجزیہ اس کتاب کے اہم خصائص ہیں۔ اس کتاب پر مصنفہ کو کلیۃ البنات جامعۃ الازہر سے ایم اے کی ڈگری ملی۔ محققین اور طلباء کے لیے یہ ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے علم و فکر میں اضافہ ہوتا ہے، تفسیر کے صحیح منہج پر اعتماد کو مضبوط کرتی ہے اور عصری فکری چیلنجز کو سمجھنے کے لیے وسیع تر افق کھولتی ہے۔ دار النشر (قاہرہ) سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی (ک، ص اصلاحی)

آثار علمیہ

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے توسط سے سیرۃ النبیؐ کی تالیف کے لیے علامہ شبلی سے شدید طلب کا اظہار

حسنِ اتفاق کہ اِمسال عیدِ میلاد النبی ﷺ سے دو تین روز قبل ایک ضرورت کے تحت مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے سرسید روم میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ۱۹۱۰ء کی فائل دیکھ رہا تھا کہ "تصحیح تاریخ اسلام اور ندوہ" کے عنوان سے ایک تحریر نظر سے گذری تو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اس تحریر کے آخر میں بڑے موثر انداز میں علامہ شبلی سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ وقت کا تقاضا ہے کہ وہ دیگر مصروفیات کو چھوڑ کر اپنے اوقات اور اپنی علمی صلاحیتوں کو سیرتِ نبوی ﷺ کی تصنیف کے لیے وقف کر دیں۔ اسی کے ساتھ صاحبِ تحریر نے یہ بلیغ و بامعنیٰ تاثر بھی ظاہر کیا تھا کہ سیرتِ نبوی ﷺ پر ایک جامع تصنیف کے لیے انھیں کا قلم درکار ہے جس کی جولانیاں "الفاروق" کی تصنیف میں نمایاں ہوئی ہیں۔ یہ تحریر اصلاً دہلی میں ۲۶-۲۸/مارچ ۱۹۱۰ء کو منعقدہ ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں منظور کردہ اِس تجویز کے پس منظر میں شائع ہوئی تھی کہ سرکاری تعلیم گاہوں کی درسی کتب میں اسلام اور تاریخِ اسلام سے متعلق مواد زیادہ تر مغربی مورخین کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ ان میں اسلام اور تاریخِ اسلام سے متعلق غلط معلومات دی گئی ہیں، ان کتابوں کو پڑھ کر بدگمانی پھیلتی ہے، لہٰذا اِن غلطیوں کی اصلاح کے لیے ایک شعبہ "صیغۂ تصحیح تاریخِ اسلام" کے نام سے قائم کیا جائے۔ مزید براں صاحبِ تحریر کی وضاحت کے مطابق اسی اجلاس میں سیرتِ نبوی ﷺ پر ایک جامع تصنیف کی ضرورت متفقہ طور پر تسلیم کی گئی اور اس سلسلے میں ضروری اقدام کی تجویز بھی منظور کی گئی۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں محولہ بالا تحریر "ابوالکمال دیسنوی" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ صاحبِ تحریر کا پورا نام نامی ابوالکمال سید عبدالحکیم دسنوی (م:۵/مئی ۱۹۵۸ء) ہے۔ موصوف مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ہم وطن و قریبی اعزّہ اور علامہ شبلی کے حلقۂ احباب و معتقدین میں سے تھے، ان کی تمام تحریکوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے اور اخبارات میں اُن کی تائید میں مضامین لکھتے تھے۔ سید صاحب کے مکاتیب کا سب سے بڑا ذخیرہ انہی کے پاس تھا۔ بعد میں انہوں نے اس قیمتی سرمایہ کو دارالمصنفین کے حوالے کر دیا تھا۔ انہیں اردو کتب و رسائل جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ دیسنہ کا اردو کتب خانہ اس بیش بہا ذخیرے کا مخزن بنا تھا۔ وہ دارالمصنفین سے بہت گہرا

تعلق رکھتے تھے اور اس کے بہی خواہوں میں سے تھے (مکاتیبِ شبلی، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ۱/ ۲۹۰، حاشیہ نمبر-۱؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، متاعِ رفتگان، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۹۱)۔ مکاتیبِ شبلی (حصہ اول) میں سید عبد الحکیم کے نام علامہ شبلی کے سات خطوط شامل ہیں۔ اِن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سیرۃ النبی ﷺ کی تکمیل کے بہت مشتاق تھے اور علامہ شبلی سے اس کی پیش رفت کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے اور وہ انہیں صورتِ حال سے باخبر کرتے تھے (مکاتیبِ شبلی، ۱/ ۲۹۰-۲۹۵)۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع شدہ زیرِ بحث تحریر کی اہمیت و معنویت کی وضاحت سے قبل اس کا متن ملاحظہ ہو:

تصحیح تاریخ اسلام اور ندوہ

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید۔ الحمدُللہ کہ ندوہ نے اس کام کی بنیاد ڈال دی ہے جس کا دلدادگانِ اسلام کو عرصہ سے انتظار تھا۔ یہ کام جس قدر ضروری ہے، اس سے کہیں زیادہ اہم اور مشکل بھی۔ اب جب کہ ندوہ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے تو حمیّت و غیرتِ اسلامی کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ ندوہ کا ہاتھ بٹایا جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ تصحیحِ تاریخِ اسلامی کے نام سے ایک فنڈ قائم کیا جائے جس کے ذریعے سے ایک کافی سرمایہ جمع کر کے جملہ یوروپین مصنفین کی تصنیفاتِ تاریخی متعلق اسلام خرید کر مطالعہ کی جائیں۔ مطالعہ کرنے کے لیے کم از کم ایک بی-اے کی ڈگری حاصل کیا ہوا ہاتھ اور بڑھایا جائے۔ اس شخص کا کام انگریزی تاریخوں کے مطالب کو ندوہ کے آگے بیان کرنا اور ندوہ کا کام ان مطالب پر تنقیدی نظر ڈال کر غلطیوں کی دلائل و براہین قاطع کے ذریعہ صحت کرنا ہونا چاہیے، اور تصحیح کردہ مضامین کو انگریزی جامہ پہنا کر بذریعہ پمفلٹس شائع کرنا چاہیے تاکہ تعلیم یافتہ مسلمان اور یوروپین حضرات یکساں مستفید ہو سکیں۔

اسی ضمن میں مجھے یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ بانیِ اسلام (غالباً بے خیالی میں یا سہواً حضور اکرم ﷺ کے لیے یہ لفظ استعمال ہو گیا ہے) کی کوئی مکمل و مستند سوانح عمری اردو میں ہے، نہ انگریزی میں۔ ندوۃ العلماء کے گذشتہ جلسۂ دہلی میں جب کہ متذکرہ بالا صفات کی سوانح عمری کی تصنیف کی ضرورت تسلیم کی جا چکی ہے اور یہ تحریک باتفاقِ آراء پاس ہو چکی ہے تو اس کام کو بھی اسی صیغہ سے متعلق کر کے خدا کا نام لے کر شروع ہی کر دینا چاہیے۔ یہ کتاب بھی اسی دماغ و قلم کی جولانی ڈھونڈتی ہے جس سے "الفاروق" کی تصنیف میں کام لیا گیا ہے۔ اس لیے قوم کو علامہ شبلی کی خدمت میں اپیل کرنی چاہیے کہ اِس بار کو بھی ہمت کر کے اپنے کاندھے پر لے

لیں۔ اگر مولانا کو اس کتاب کے لیے مواد تلاش کرنے کو پھر مصر و شام کے سفر کرنے کی ضرورت ہو تو قوم کو سامانِ سفر مہیّا کر دینے میں کوئی دریغ و پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔ کیا اتنی سی مدد قوم کے لیے کوئی بڑی بات ہے؟ ہر گز نہیں، ہر گز نہیں! ہمت چاہیے۔ مولانا کی خدمت میں بھی دست بستہ التجاء ہے کہ وہ اپنی دوسری زیرِ تصنیف کتابوں کا لکھنا موقوف کر کے اپنا وقت آنحضرت ﷺ کی سوانح کی نذر کر دیں۔

میری دعاء ہے کہ خدائے تعالیٰ جلّ شانہ آفاتِ زمانہ سے محفوظ رکھ کر اُن کو صحت و تندرستی کے ساتھ اس وقت تک قائم رکھے جب تک اس اسلامی مشنِ ندوۃ العلماء کے کُل اغراض و مقاصد کی تکمیل نہ ہو لے۔ ایں دعاء از من و جملہ جہاں آمین باد۔ راقم ابو الکمال دیسنوی

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد نمبر - ۱۰، شمارہ نمبر -۳۱، ۱۰/ اگست ۱۹۱۰ء، ص ۱۲)

نوٹ: اِس تحریر سے وقت کے تقاضے کے مطابق سیرتِ نبوی ﷺ پر ایک ایسی جامع تصنیف کی ضرورت و افادیت واضح ہوتی ہے جس میں حیاتِ مبارکہ کے واقعات اور اسوۂ حسنہ ﷺ کے تمام پہلو شرح و بسط کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہوں اور دوسری جانب سیرت پر یوروپین اسکالرز کے لٹریچر پر ناقدانہ نظر ڈال کر اُن کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہو اور اُن کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا گیا ہو تاکہ اس سے نئے تعلیم یافتہ اہلِ اسلام اور مغربی اسکالرز دونوں مستفید ہو سکیں۔ سیرت پر ایک جامع کتاب کی نوعیت کی نسبت سے صاحبِ تحریر نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کے حوالے سے یہ ذکر بر محل معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر عبد القادر، پونہ کو جون ۱۹۱۱ء میں مرسلہ اپنے خط میں علامہ شبلی نے سیرت نبوی ﷺ پر اپنی زیر تصنیف کتاب کی خصوصیت ان الفاظ میں واضح کی ہے: "سیرتِ نبوی ﷺ جو زیرِ تصنیف ہے، میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت ﷺ کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ اُن کے تائیدی بیان حسبِ موقع حجّتِ اسلامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں جہاں انہوں نے غلطیاں اور بد دیانتیاں کی ہیں، نہایت زور و شور کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے" (مکاتیبِ شبلی، ۱/ ۲۱۵)۔

زیرِ تعارف تحریر کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ اس میں سیرت پر اِس تصنیفی کام کو ملت کی اجتماعی فلاح و بہبود سے مرتبط کیا گیا ہے اور اہل ملت سے یہ طلب ظاہر کی گئی ہے کہ وہ خود اس کام کے لیے علامہ شبلی سے اپیل کریں کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کر لیں اور اگر اس کام کی انجام دہی میں کچھ وسائل کی ضرورت ہو تو ملت کے بہی خواہان بلا پس و پیش اس کے لیے آگے بڑھیں اور یہ ان کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔

اس تحریر کا یہ نکتہ خصوصی توجہ کا طالب ہے کہ سیرت نبوی ﷺ پر مثالی تصنیف کے لیے صاحبِ تحریر کی نظر انتخاب علامہ شبلی پر پڑی۔ بلا شبہ یہ اُن کی زبردست تصنیفی صلاحیتوں کا اعتراف اور ان کی تصنیف کردہ کتابوں کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اس ذیل میں صاحبِ تحریر کا یہ تاثر بڑی معنویت کا حامل ہے کہ "الفاروق" کی تصنیف میں جس قلم کی جولانی کارفرما رہی ہے، سیرت کی مجوزہ کتاب کی تصنیف کے لیے اسی قلم کی جولانی درکار ہے، یعنی سیرت پر ایک جامع کتاب تالیف کرنے کا حق "الفاروق" کے مصنفِ محترم ہی ادا کرسکتے ہیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ "سیرۃ النبی ﷺ" کی اشاعت سے قبل رسالہ "زمانہ"، کانپور کے ایڈیٹر کے استفسار کے جواب میں علامہ شبلی نے یہ تحریر فرمایا تھا: "میں اپنی تصنیفات میں "الفاروق" کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں" (مکاتیبِ شبلی، ۱/۲۰۱)۔

مزید یہ کہ صاحبِ تحریر نے جس عاجزانہ انداز میں علامہ شبلی سے یہ التجا کی تھی کہ وہ دیگر علمی مصروفیات کو موقوف کرکے سیرت پر تصنیفی کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صاحبِ تحریر نے نہ صرف خود یہ محسوس کرلیا تھا کہ سیرتِ نبوی ﷺ پر ایک جامع و مبسوط تصنیف وقت کی ایک بہت ہی اہم ضرورت ہے، بلکہ اہلِ ملت کی توجہ بھی اس جانب مبذول کرائی اور اس اہم تقاضے کی تکمیل کے لیے انہوں نے علامہ شبلی (جنہیں وہ اس علمی و دینی خدمت کے لیے سب سے زیادہ اہل سمجھتے تھے) سے دست بستہ درخواست بھی کی۔

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ "سیرۃ النبی ﷺ" کی پہلی اشاعت (۱۹۱۸ء) کو سو برس سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود اردو میں سیرتِ نبوی ﷺ پر اِس جیسی یا اس پایہ کی کتاب ابھی تک وجود میں نہ آسکی، یعنی یہ بے نظیر بنی رہی۔ واقعہ یہ کہ خود علامہ شبلی نے اپنی کتاب کی بابت جو توقع ظاہر کی تھی وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ ۲/نومبر ۱۹۱۲ء کو انہوں نے اپنے ایک ہمدرد و بہی خواہ منشی محمد امین صاحب (ریاستِ بھوپال) کے نام خط میں یہ لکھا تھا: "میں جانتا ہوں کہ (سیرت کا کام) دو برس میں نہ ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ سرکار بھوپال رقم بند کردیں، لیکن اب روپیہ کا نہیں، بلکہ میری جان کا معاملہ ہے، ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا، اور اگر مرنہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو اِن شاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی" (مکاتیبِ شبلی، ۱/۲۳۱)۔

ظفر الاسلام اصلاحی
اسلام منزل، اقرا کالونی، علی گڑھ

تبصرۂ کتب

مولاناڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، مشاہیر شعرائے فارسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذوطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات:۳۰۴، قیمت:۳۰۰روپے، سن اشاعت:۲۰۲۴ء، پتہ: کمال بک ڈپو، مدرسہ شمس العلوم گھوسی، مئواورایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ایچ۔او،D1/16انصاری روڈ، دریاگنج، نئی دہلی ۲۔ایمیل:info@ephbooks.com

اس کتاب کے فاضل مصنف کو فارسی زبان کی محبت خاص طور پر ودیعت کی گئی ہے اور اس کا ثبوت ان کے قلم سے نکلے کئی فارسی کتابوں کے عمدہ ترجمے ہیں۔ ان میں بعض کا ذکر ان صفحات میں بھی آتا رہا ہے۔ پیش نظر کتاب بھی فارسی زبان و ادب سے ان کی محبت اور حد درجہ تعلق کی ترجمان ہے، کتاب کا انتساب بھی اسی وابستگی کا اظہار ہے۔ جس میں غلام علی حداد عادل کے اشعار نے فارسی کو دردریائے دری، میراث نیاکاں، زبان دانش وفرزانگی، آفتاب خاوری کی ضوفشانی جیسی تعبیرات سے یاد کرتے ہوئے بات اس پر ختم کی کہ:

قدر زر زرگر شناسد، قدر گوہر گوہری

رودکی اور دقیقی طوسی سے بیدل وغالب اور پھر عارف قزوینی سے اقبال تک شعراء کے احوال اور ان کی شاعری کے جامع جائزہ میں نیت یہ بھی شامل رہی کہ مذاق عام کے فارسی سے محروم ہونے کے بعد طلبائے فارسی اور فارسی کے کم ہوتے قدردانوں اور مرتبہ شناسوں کے ذوق مطالعہ کو زندہ اور تیز کیا جائے۔ سخندان پارس، تاریخ ادبیات ایران اور سب سے بڑھ کر شعر العجم کے بعد اس قسم کی کتابوں کی ضرورت بھی کم ہی ہوتی گئی، لیکن مزید کی طلب سے کبھی انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب کی افادیت اور ضرورت کی تائید میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس میں جدید فارسی شاعری کے شعراء کے تذکروں نے اس کو مفید تر بنادیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ افادیت اس کے مفصل مقدمہ میں ہے جس میں گویا فارسی زبان کی مستند تاریخ کا خلاصہ اس طرح آگیا کہ اوستا اور پہلوی کی تاریخی اہمیت کے ساتھ تیسری صدی سے عصر حاضر تک ایرانی ادوار حکومت کا احاطہ کیا گیا اور ہر عہد کی حکومت کی ادبی و شعری سرپرستی کی ایسی جھلک پیش کردی جس سے زبان وادب کی ایک کامل تصویر سامنے آگئی۔ طاہریہ سے صفویہ و قاچاریہ تک یہ جائزہ ہی

کتاب کے موضوع سے انصاف کے لیے کافی تھا لیکن خوبی مستزاد یہ کہ اس میں ہندوستان میں فارسی ادب کو بھی حکومتوں کے زمانوں کے لحاظ سے پیش کر دیا گیا۔

شعراء کے تذکروں میں یا انتخاب کلام میں عموماً اختصار کو سامنے رکھا گیا اور یہ شاید اس لیے کہ طلبۂ فارسی کے لیے یہ انداز زیادہ آسان اور مفید ہو سکے۔ اس اختصار میں معلومات کے وفور کے ساتھ اسلوب کی دلکشی بہر حال متاثر نہیں ہوئی۔ غالب کے بیان میں یہ کہنا اچھا لگا کہ ہر بڑے شاعر کی دنیا میں داخل ہونے اور وہاں زندگی گزارنے کے اپنے الگ آداب ہوتے ہیں۔ انہیں برتنے لگیے تو انکشافات کے حیرت انگیز اور معنی خیز ابواب کھلتے چلے جائیں گے۔۔۔ زمانہ عرفی کو لے گیا اور غالب کو وجود بخش گیا، خوب سے خوب تر کی طرف یہ سفر شاعری کے لیے سرمایہ ناز ہے:

کہ بر د عرفی و غالب بہ عوض باز دہد

جدیدیت کے متعلق یہ کہنا بھی خوب ہے کہ یہ بگاڑ اور بناؤ دونوں کا سنگم ہے اور یہ کلام بھی برحق ہے کہ اقبال نے اردو ہی کی طرح فارسی شاعری کی بھی تجدید کی اور یہ کتاب بھی فارسی کا ذوق رکھنے والوں کے لیے گویا شعر العجم کی تجدید کی کوشش ہے اور اس کے لیے فاضل مصنف مستحق سپاس ہیں۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

پروفیسر حمیدہ بانو، سرگوشی: متوسط تقطیع، بہترین اور دیدہ زیب کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۱۶، قیمت: ۵۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۶ء، پتہ: عرشیہ پبلی کیشنز ۱۷۰۔A، گراؤنڈ فلور ۳، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی۔۹۵، موبائل نمبر: ۹۹۷۱۷۵۵۹۶۹

سرگوشی کا لفظ ایک ایسے جہان کی جانب اشارہ کرتا ہے جہاں دل کے جذبات کے اظہار میں تنہائی ہو، خاموشی ہو اور گفتگو گویا صبا و نسیم کے دوش گوش پر ہو۔ سننے والا بھی وہ ہو جس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو، گفتگو بھی بس واردات قلب کی بے حرف و لفظ ترسیل ہو۔ اس کے لیے دوسری تعبیر مناجات کی بھی ہے لیکن سرگوشی کی سرّیت اس کے جداوجود کے جواز ہی کی طالب ہے۔

پیش نظر نہایت خوبصورت کتاب میں یہی سرگوشی، بدلتے ہوئے مناظر اور فطرت کی بوقلمونی میں سرگوشیوں میں بدل گئی ہے۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ وہ مقامات آہ و واہ ہیں، جہاں فطرت کے ایسے نقوش نگاہوں میں سما لیے گئے ہیں جو لمحاتی ہونے کے باوجود عارضی اور ناتمام نہیں اور اس لیے نہیں کہ ان میں خون جگر کی سرخی سب سے نمایاں رنگ لیے ہوئے ہے۔

ہر سرگوشی کو ایک خوبصورت عنوان دیا گیا ہے۔ کہیں صرف چند سطریں کہیں کچھ اور زیادہ، مگر ذوق نظر سب میں یکساں، وہی ذوق نظر جو شے کی حقیقت آشنائی کا ہنر رکھتا ہے اور اس ہنر کا مقصود بھی اہل دل کے لیے پوشیدہ نہیں کہ وہی تو ہے جو سوز حیات ابدی ہے۔ اور اس کو پانے کے لیے صحن گلستاں میں مانند سحر قدم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ تہ پا، گوہر شبنم بھی آئے تو ٹوٹ نہ پائے۔

کتاب کی مصنفہ کو فطرت نے یہ آداب سکھائے کہ قدرت کا ہر منظر تب ہی خوبصورت اور روح پرور ہے جب وہ قادر مطلق سے قریب تر کردے۔ لکھا کہ قدرت کے حسین مناظر، چرند پرند، پیڑ پودے، پھول پتے اور ننھے منے کیڑے مکوڑے سب کا شکریہ اس لیے ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے مجھے لکھنے کا یا سرگوشی کا ایسا ہنر سکھایا کہ میرے وجود کو میرے رب سے قریب کردیا اس حرف تشکر کے بعد آغاز اس انداز تکلم سے ہوا کہ "فطرت کو زور سے بات کرنے کی عادت نہیں، اس کا انداز تکلم، انداز سرگوشی ہی ہے، تم سننے کی عادت ڈالو"۔ ایک صفحہ پر بس اتنا ہی کہ "میری خوش نصیبی کہ تو نے مجھے حمد کرنا سکھایا"۔ سرگوشی میں یہ تمنا کہ "کاش تیرے خورشید جیسی شخصیت میسر ہوتی۔ آتا ہے تو رنگ لیے، جاتا ہے تو رنگ بکھیرتے ہوئے"۔ طوفان بادوباراں کا سماں، سب کی نظروں سے گزرتا ہے لیکن سرگوشی یہ کہتی ہے کہ "اب جو صبح دیکھتی ہوں تو بادل تھکا تھکا، نہ ذرے کو جنبش نہ پتے کو حرکت، صباچپ، ہواچپ، نسیم ساکت، خاموشی والی خاموشی، سبحان اللہ، ایک رنگ وہ تھا اور ایک رنگ یہ ہے"۔ "تو نے کہا ہے ربّا کہ ہم نے دنیا کے آسمان کو چراغوں سے سجایا ہے، میرا جی کرتا ہے کہ میں اپنی جبیں کو تیرے سجدوں سے سجالوں"۔ سرگوشی کو مناجات میں بدلنے کا یہ عمل کہ "ربّا دل مطمئن ہے کہ تو اس دن کا مالک ہے، تو جو رحمن ورحیم ہے۔ ہم گنہگاروں کے لیے یہ بات یقیناً باعث سکون ہے کہ تو اور صرف تو اس دن کا مالک ہے"۔

یہ پوری کتاب ایسی ہی سرگوشیوں کا وہ گوشہ بن گئی، جہاں دل اور دماغ کی دنیا میں صرف ٹھنڈے اجالے ہیں۔

اردو میں صنف انشائیہ کی اگر واقعی بامعنی مثال تلاش کی جائے تو شاید یہ کتاب سب سے پہلے نظروں میں سما جائے۔

مصنفہ کی زندگی کا سفر اودے پور کی خوبصورت وادیوں اور جھیلوں سے شروع ہوا اور اب یہ امریکا کے ایسے مقام تک پہنچا جہاں کوہ و کمر کے ساتھ سمندر اور ساحل ہیں۔ قدرت اور فطرت کی یہ فیاضیاں آئی آئی ٹی کی ایک معلمہ کے دامن میں آئیں اور کمال ہے کہ ان کو یہ تعلیم دے گئیں کہ ادب محض تخلیقی اظہار نہیں ایک تہذیبی امانت اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ دور جدید میں جہاں آرا کی مونس الارواح کی دیدہ زیبی کو یاد دلانے والی اس کتاب کے لیے مصنفہ کے ساتھ خود اردو کی کتابی دنیا مبارک باد کی مستحق ہے۔ (ع۔ص)

مولانا محمد اسعد قاسمی، بزم رفتہ کے چراغ: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات:۲۹۲، قیمت:۳۰۰روپے، پتہ:مرکز دعوت وارشاد، دارالعلوم الاسلامیہ بستی، یوپی ۲۷۰۰۰۱، اور دیوبند، مرادآباد، لکھنؤ اور دہلی کے معروف مکتبے۔

بزرگوں اور معاشرے کے نامور انسانوں کے بے شمار تذکروں کا سلسلہ، فطرت کے اخلاقی ضابطوں کا عطا کردہ ہے اور اس میں بقا اور دوام کی خوبی ہے۔ عالمی ادب کی طرح، اردو ادب میں بھی کئی اصناف سخن میں ترقی و تنزل کا عالم رہا مگر تذکرہ نگاری کا فن ہر نشیب و فراز سے بے نیاز، اور اہل قلم کی مستقل نیاز مندی سے بہر حال سرگرم سفر رہا۔ زیر نظر کتاب بھی یادوں کی دنیا آباد کرنے کی ایسی ہی موثر و مبارک کوشش ہے۔

فاضل مصنف ایک کامیاب اور ماہر مدرس ہونے کے ساتھ، ایک صاف ستھرے اور ہموار واستوار اسلوب والے صاحب قلم ہیں۔ ایک علمی رسالہ کے مدیر بھی ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوا کہ انسانوں کے مطالعہ میں بھی ان کو مہارت حاصل ہے۔ ستر کے قریب 'اکابر مرحومین' کی شخصیت اور ان کے علمی و اخلاقی احوال ان کی اس کتاب میں آگئے، چند مضامین مستعار بھی ہیں۔ فہرست میں مرحومین کی تاریخ وفات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ پہلا مضمون مولانا وحید الزماں کیرانوی پر ہے جن کا انتقال ۱۹۹۵ء میں ہوا تھا اور آخری تحریر، مولانا محمد ولی رحمانی پر ہے جنہوں نے ۲۰۲۱ء میں وفات پائی۔ گویا ربع صدی میں عالم فانی سے رخصت ہونے والوں کی باقی رہ جانے والی یادیں اس کتاب میں سمٹ آئی ہیں۔ مصنف کی شخصی سادگی اور سچائی ان تحریروں میں نمایاں ہے، کہیں کہیں مبالغے کا احساس تو ہوتا ہے مگر ناگوار نہیں جیسے مولانا وحید الزماں کیرانوی کے بارے میں یہ کہنا کہ عربی خطابت میں ان کی مثال ہی نہ تھی، برصغیر میں ان جیسی عربی زبان بولنے والا شاید ہی

کوئی رہا ہو۔ مولانا احمد رضا بجنوری کے اوصاف کو جو عموماً علمائے امت میں نظر آتے ہیں ان کو محض علمائے دیوبند کی شناخت بتادینا بھی اسی معصومانہ مبالغہ کا نمونہ ہے۔ مولانا علی میاں ندوی کے متعلق لکھا کہ وہ ایسے عالم و شیخ تھے جن سے اقوام و ممالک کی قسمتیں اور تقدیریں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ بھی خوب لکھا کہ ان کو وہ عزت و مقبولیت حاصل ہوئی جو ان کے معاصر علماء میں کسی کو بھی حاصل نہ تھی۔ (ع۔ص)

ڈاکٹر محمود حافظ عبدالرب مرزا (مترجم)، اصحاب بدر (مختصر سوانح اور کارنامے)، صفحات ۴۵۰، الکتاب انٹرنیشنل، نئی دہلی، ۲۰۲۶ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۱۲۵۰۸۷۶۲۔

زیر نظر کتاب ڈاکٹر سلیمان بن احمد العودہ استاذ تاریخ و سیرت، جامعہ القصیم (سعودی عرب) کی تصنیف "البدریون" کا اردو ترجمہ ہے۔ "بدری صحابہ" کا موضوع سیرت کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہے۔ ایک مسلمان کو اسلام کے لیے اپنی جان و مال کا نذرانہ پیش کرنے والے ان اولین جاں نثاروں کے حالات سے جس قدر دلچسپی ہوگی وہ کسی اور انسانی طبقے سے نہیں ہوسکتی۔ اس موضوع پر اس سے پہلے بھی اردو میں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں سب سے زیادہ شہرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی "بدرالبدور معروف بہ اصحاب بدر" کو ملی۔ اس میں قاضی صاحب نے تقریباً تمام بدری صحابہ کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ لیکن جدید تحقیقی معیار کے مطابق ایسی جامع کتاب کی گنجائش باقی تھی جس میں ہر صحابی کے بارے میں مختلف روایات کا تقابل، تخریج اسماء، نسب کی تحقیق، شرکت بدر کی تعیین و وفات اور ان کے مناقب و فضائل کا ذکر مستند حوالہ جات کے ساتھ کیا جائے۔ زیر نظر کتاب ان خصوصیات کی حامل ہے۔ لائق مترجم نے چند سال صرف کرکے اس کو اردو کا ایسا جاذب و دلنشیں قالب عطا کیا جس کی عدم تحسین ناانصافی ہوگی۔

مطالعہ میں آسانی کے مقصد سے اس کی ترتیب ہجائی رکھی گئی ہے۔ اس میں کل ۱۰۷ بدری صحابہ کے حالات ہیں۔ اس طرح ابھی اس میں نصف سے بھی کم بدری صحابہ کے حالات قلم بند ہوسکے ہیں۔ بقیہ اصحاب بدر کے حالات بعد میں مرتب کرنے کا ارادہ مقدمے میں ظاہر کیا گیا ہے۔ بہر حال جو سامنے آئے ہیں وہ بسا غنیمت اور کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

مصنّف نے تقریباً ۱۷ صفحات پر مشتمل تمہید میں اصحاب بدر پر گفتگو کے اسباب، ان کی فضیلت، تعداد، ان کے لیے جنت کا واجب ہونا اور مسلمانوں میں ان کا سب سے افضل ہونا، ان کو

برا بھلا کہنے کی ممانعت اور کیا بدر میں کوئی منافق بھی شریک تھا؟ وغیرہ جیسے اہم امور زیر بحث آئے ہیں۔ مصنّف کے بہ قول یہ موضوع جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔ انہوں نے جن دشواریوں کا ذکر بجا طور پر مقدمے میں کیا ہے ان میں اصحاب بدر کی تعداد کے بارے میں اختلاف، بعض بدری صحابہ کے حالات کا بہت کم ملنا اور متقدمین کے یہاں کسی ایسی کتاب کا نہ ہونا بتایا ہے جس میں ان کی حیات و مناقب کا مفصل تذکرہ یکجا ہو۔ اصحاب بدر پر گفتگو کے جن معقول اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے اس کے مطابق بدری صحابہ خیر القرون ہیں، ان کی سیرت میں نئی نسلوں کے لیے سبق ہے، ان کی فضیلت و عظمت مسلم ہے۔ اس کے علاوہ عہد حاضر کے عام مسلمان صحیح معنوں میں ان نفوس قدسیہ کے فضائل سے ناواقف ہیں اس لیے بھی ان پر گفتگو ضروری ہے۔ اساتذہ، طلبہ، خطباء اور محققین کے لیے ترتیب دی جانے والی اس کتاب میں اصحاب بدر کا ایمانی اور تربیتی پہلو بہ طور خاص پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مترجم عربی کے علمی و ادبی اسلوب سے اچھی طرح واقف ہیں اور تقریباً ۱۴ برس سے الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی ادب کے استاذ ہیں۔ اس سے پہلے بھی ان کے کئی ترجمے منظر عام پر آچکے ہیں۔ مترجم مستحق تبریک ہیں کہ ان کی بدولت اردو خواں طبقے کو اس سے استفادے کا موقع ملا۔ پروف کی غلطی کم نظر آئی۔ پوری کتاب میں صرف ایک جگہ "مترجم" کا حاشیہ ص ۳۱ پر "اہل رویبضہ" کی وضاحت میں یہ نظر آیا: "ایسے بے کار اور نام نہاد افراد جو عوامی مسائل پر اپنی رائے تھوپتے ہوں"۔ حالانکہ اور بھی مقامات پر حواشی کی ضرورت تھی۔ نثری عبارت سے قطع نظر یہاں بعض اشعار کے ترجمے پیش ہیں جن سے ان کے ترجمہ کا انداز سمجھا جاسکتا ہے۔ ص ۱۵۳ پر اس شعر:

أحبک والرحمن حب قریش لعثمان

کا ترجمہ "بخدا! میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں جیسے قریش حضرت عثمان سے کرتے تھے"، کیا ہے۔

اسی طرح درج ذیل شعر:

ونسلمہ حتی نصرع حولہ ونذھل عن أبنائنا والحلائل

کا ترجمہ یوں کیا ہے: "حضورؐ کو ہم اس وقت دشمنوں کے حوالے کریں گے جب ہم ان کے گرد لڑتے لڑتے خون میں لت پت ہو جائیں گے اور اپنے بچوں اور بیویوں کو بھول جائیں گے"۔

کتاب اپنے مقصد میں کامیاب، مستند، مفید اور مصنّف و مترجم دونوں کے لیے یقیناً توشۂ آخرت ہے۔ امید یہی ہے کہ اس کو حسن قبول حاصل ہو گا۔ (کلیم صفات اصلاحی)

سید نفیس دسنوی، آئینۂ ادراک، صفحات:۲۰۸، ۱-پلاٹ نمبر ۱۴۸۱/بی، سیکٹر-۶، سی، ڈی، اے بیداناسی، کٹک (اوڈیسہ)، ۲۰۲۴ء، قیمت:۲۵۰ روپے، موبائل نمبر:۹۴۳۷۰۶۷۵۸۵۔

زیر نظر کتاب مصنّف کے پینتیس مقالات کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں کل تین ابواب ہیں۔ پہلا باب صنف شاعری سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے جس میں شاعری کی تعریف، صنف غزل، حمد و مناجات، تلمیحی شاعری، اردو شاعری میں ماہیے، نظم نگاری، دوہانگاری، نعت گوئی اور رباعی نگاری کے علاوہ معیاری شاعری کے لوازمات، مشاعروں اور اصلاح سخن کی روایتوں پر ادبی گفتگو کی گئی ہے۔ مصنّف نے ماہیے نگاری کی قدیم روایت کا سر آغاز سترہویں صدی کے اختتامی عشرے سے جوڑا ہے کہ لفظ ماہی پنجابی لوک گیتوں میں محبوب کی علامت کے طور پر سب سے پہلے ۱۶۹۸ء میں استعمال ہوا۔ مزید لکھتے ہیں کہ اردو میں ماہیے کی روایت کا آغاز گزشتہ صدی کے اوائل میں ہو چکا تھا اور دلیل کے طور پر مولانا حسرت موہانی اور قمر جلال آبادی کے بعض ماہیے بھی نقل کیے ہیں۔ ماہیا کی موجودہ حالت کے متعلق ان کا خیال ہے کہ آج ماہیے کی صنف برصغیر کے علاوہ کناڈا، جرمنی، جاپان، امریکہ جیسے ممالک میں اپنا سکہ جما چکی ہے۔ لیکن مصنّف نے یہاں کے کسی شاعر کا نام نہیں لکھا ہے۔ اردو میں ماہیے کو ادبی سطح پر متعارف اور مقبول بنانے والوں میں حفیظ جالندھری، قیوم نظر، ناصر کاظمی وغیرہ کا نام مشہور ہے۔ اصلاح سخن کی روایت پر مضمون ہلکا ہے۔ مشاعروں کی روایت والے مضمون میں مصنّف کا یہ خیال درست ہے کہ آج بھی عوامی مشاعروں کی مقبولیت اردو زبان وادب کے لیے نافع ہے اور اردو زبان وادب کی بقا کے لیے اسے قبول کر لینے میں سمجھ داری ہے۔ باب دوم صنف ادب کے لیے مختص ہے۔ اس کے تحت تنقید نگاری، تبصرہ نگاری، انشائیہ نگاری، داستان گوئی، افسانہ نگاری، مکتوب نگاری، ترجمہ نگاری، مکالمہ آرائی، ناول نگاری کی روایت واہمیت اور اس کی معنویت کا جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی اردو رسم الخط کی انفرادیت، تصوف اور فلسفۂ معرفت وجمالیات، سفر نامہ کی روایت، تحقیق کے بنیادی مقاصد اور کتب بینی کے عمدہ مشغلے پر دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں پروفیسر کرامت علی کرامت، سید شکیل دسنوی، سعید رحمانی، خالد رحیم اور عبد المتین جامی جیسے اردو کے مشہور اہل قلم کی شخصیت پر تاثراتی مگر جامع تحریر ہے۔

مصنّف اس میدان میں گرچہ نووارد ہیں مگر مقالات کا تنوع، عام فہم اسلوب، سادہ اور رواں نثر دامن دل کو کھینچتی ہے۔ کتاب کی افادیت مسلم ہے۔ البتہ بعض مواقع پر جملوں کی ساخت وترکیب میں جھول اور لغزش بھی موجود ہے۔ درجنوں کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن ایک علمی وادبی کتاب کا حواشی اور کتابیات سے بے نیاز ہونا حیرت انگیز ہے۔ (ک۔ ص اصلاحی)

ڈاکٹر احتشام الدین خرم، مضامین ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ۲۰۲۲ء، صفحات: ۲۳۸، قیمت: ۴۰۰ روپئے، ایمیل: mohdfurrukh77@gmail.com، موبائل: ۹۸۸۵۹۷۴۸۲۸، ۷۸۹۳۵۷۳۸۵۵

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ؒ (۱۹۰۸ء- ۲۰۰۲ء) کا شمار عالمِ اسلام کی ان یگانہ روز شخصیات میں ہوتا ہے، جن کی اعلیٰ قابلیتیں و عظیم علمی خدمات کا ایک جہاں قائل ہے۔ وہ بیک وقت بلند پایہ مترجم، معروف محقق، قانون داں اور اسلامی دانشور کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور بین الاقوامی قوانین پر ان کی گہری نظر تھی۔ فرانسیسی زبان میں ترجمۂ قرآن ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ پر اعلیٰ تحقیقی، کام اور مغرب کے قلب میں اشاعتِ اسلام کا اہم فریضہ انجام دینے پر ان کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اردو، عربی، فرانسیسی، جرمن، قدیم و جدید ترکی، اطالوی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر مہارت رکھتے تھے۔ اسی بناپر انہوں نے سات زبانوں میں تحریر و تحقیق کا کام انجام دیا ہے۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ انہوں نے فرانسیسی، جرمن، عربی، فارسی اور ترکی زبان میں ایک ہزار سے زائد اہم موضوعات پر تحقیقی و علمی مضامین و مقالات لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد ۱۷۵ سے زائد ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی بلند تحقیق کے مقاصد کی خاطر بہت سے اسلامی اور یورپی ممالک کا دورہ کیا۔ انھوں نے اپنی معروف کتاب "عہد نبوی ﷺ کے میدان جنگ" کے سلسلے میں نجد و حجاز کے ان میدانوں کا سفر بھی کیا جہاں یہ جنگیں لڑی گئی تھیں وہاں پہنچ کر بنفس نفیس پہلے مشاہدہ کیا اور تاریخی مواد اکٹھا کیا۔ اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ موجود ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر حمید اللہؒ کا ایک بڑا کارنامہ حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد حضرت ہمام ابن منبہؒ کے صحیفے کی تدوین کا کام ہے۔ فرانسیسی زبان میں ان کے ترجمۂ قرآن کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ انہوں نے فرانسیسی میں سیرت نبوی ﷺ بھی تحریر کی جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس کتاب کا سلیس اردو ترجمہ "سیرت رسول اسلام" حال ہی میں جامعۃ الفلاح کے استاد مولانا ذکی الرحمن غازی نے دو جلدوں میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام محمد شیبانی کی "کتاب السیر" اور شاہ ولی اللہ کی "حجۃ اللہ البالغہ" کا فرانسیسی ترجمہ بھی انھوں نے کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں دس مضامین شامل ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے: نوابط کی وجہ تسمیہ اور ان کا

سلسلۂ نسب وغیرہ، نوایۃ، اہل نوایط کا ہندوستان آنے کا زمانہ، مولوی عبد القادر، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے خاندانی حالات، نادر کتابیں اور پروانے، عہد رسالت کی رسومات (ولادت سے وفات تک)، امت مسلمہ کی تمام زبانوں کے لیے عربی رسم الخط کی ضرورت، مسلمانوں نے کولمبس سے پہلے امریکہ کو دریافت کیا۔

ڈاکٹر حمید اللہؒ نے نوائط کی وجہ تسمیہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اہل نوائط کے تین سلسلے پائے جاتے ہیں، جن کے نسب ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔ دکن کے اکثر شہروں میں نوائط یا نوائت آباد ہیں (ص:۱۳)۔ نوایط کا تیسرا سلسلہ حضرت امام جعفر صادقؓ کے فرزند اسماعیل سے ملتا ہے۔ اسماعیل کے فرزند عبد اللہ تھے اور عبد اللہ کے فرزند وائط تھے۔ اس تیسرے سلسلہ کے لوگ اپنے ناموں کے ساتھ سید کا لفظ نہیں لکھا کرتے۔ کیوں کہ امام المدرسین مولانا محمد حسین شہید بیدریؒ نے، جن کا تعلق سلسلۂ ثالث سے ہے، اپنی اولاد کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے زبان و قلم سے اظہار سیادت نہ کریں (ص:۱۹)۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے "قرآن شریف کی سال گرہ" کے تعلق سے اس مضمون کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ایک غیر متعلق لیکن دلچسپ چیز پر اسے ختم کرتا ہوں۔ سنا گیا کہ دین دار[1] صدر پاکستان کی سرپرستی میں قرآن مجید کو ریشمی کپڑے پر سنہری تاروں سے کاڑھا جارہا ہے۔ چند ماہ ہوئے کہ کتب خانہ پیرس کے ایک مسلمان افسر مصر بھیجے گئے تو وہاں انہوں نے بالکل ایسا ہی ایک قرآن مجید دیکھا جو ایک ٹن وزنی ہے اور ہندوستان سے آیا ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ بغداد کی تباہی کے بعد جب مصر میں نئی خلافت عباسیہ قائم ہوئی اور محمد تغلق نے ایک سفارت کار بھیج کر بیعت بھی کی اور اپنی حکومت کی دربار خلافت سے توثیق بھی کرائی تو یہ شان دار تحفہ وہاں بھیجا۔ والحمد للہ! یہ بھی ایک معاشرہ اور توارد ہے (ص:۱۶۸)۔

مجموعی لحاظ سے اس کتاب کے تمام مضامین تحقیقی ہیں۔ ان مضامین میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی سیرت و سوانح، خاندانی حالات، علمی کارناموں پر قدرے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ توقع ہے کہ قارئین ان مضامین سے خاطر خواہ ضرور استفادہ کریں گے۔ (فضل الرحمن اصلاحی)

---

[1] غالباً جنرل ضیاء الحق مرحوم کی طرف اشارہ ہے۔

حمد باری تعالیٰ

ڈاکٹر راہی فدائی
بنگلور (کرناٹک، بھارت)، موبائل: ۹۴۴۸۱۶۶۵۳۶

ایک اکیلا لا محدود — ساری حدوں کا وہ مقصود
حرف و نوا میں اس کا وجود — شاہد معنیٰ ہے مشہود
دل ہے معطر ، اس کا نام — بے شک رشک عنبر و عود
اس کی اماں میں آگئے ہم — نفس کی سازش اب بے سود
پھر بھی ہم سب اس کے عیال — بے والد وہ ، بے مولود
غرق حمد ہیں لاکھوں قلم — سوکھ گئے ہیں بحر و رود
اشرف بن گیا ذرّۂ خاک — حاسد انجم ، وہ محسود
حکم خدا ہے سرّ خودی — عابد کون ہے ، کیا معبود
موسم موسم حق کا چراغ — روشن روشن اس کا دود
جان جہاں ہیں اس کے حبیبؐ — عرش و کرسی محو درود
کلمۂ حق ہے اک باقی — باقی سب کچھ ہے مفقود
رحم و کرم ہے ہر لمحہ — فرط سخا ہے ، کثرت جود
اس کا تصور سانسوں میں — دل پہ درخشاں راز سجود

سمت حرم ہیں نقش قدم
بخت سفر راہیؔ! مسعود

رسید کتب موصولہ

مفتی عبدالکریم ندوی، **اسلام: امن وسلامتی کا مذہب:** مکتبہ شباب علمیہ، شباب مارکیٹ، نزد ندوۃ العلماء، لکھنؤ، صفحات:۳۳۶، سالِ اشاعت:۲۰۲۶ء، قیمت:۵۰۰روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

محمد سمعان خلیفہ ندوی، **رہ نوردِ شوق:** ادارہ ادبِ اطفال، بھٹکل، کرناٹک، صفحات:۳۸۴، سالِ اشاعت:۲۰۲۵ء، قیمت:۴۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۹۱۶۷۷۱۴۱۴

محمد نعمان خاں، **سخنورانِ بھوپال** (حصہ اول): بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال، صفحات:۴۶۴، سالِ اشاعت:۲۰۲۶ء، قیمت:۵۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۸۹۱۴۲۴۰۹۵

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی، خلیل احمد حسنی ندوی (مرتب)، **صحابۂ کرام اور اہل بیت عظامؓ:** دارالرشید، خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ، صفحات:۱۳۶، سالِ اشاعت:۲۰۲۶ء، قیمت:۱۸۰روپے، موبائل نمبر:۹۴۵۲۲۹۴۰۹۷

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، **قرآنی کتب (تعارف و تجزیہ):** خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، صفحات:۲۶۸، سالِ اشاعت:۲۰۲۶ء، قیمت:۵۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۸۹۷۶۷۴۵۵۰

ڈاکٹر ابو معاذ، **کچھ درد مرے:** دارالعلم (چلڈرن اکیڈمی)، علاء الدین پٹی، اعظم گڑھ، صفحات: ۲۱۰، سالِ اشاعت:۲۰۲۵ء، قیمت:۲۵۰روپے، موبائل نمبر:۸۷۳۷۰۰۸۴۸۸

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، *Mob Lynching in India, A Record: 2014-2024*، فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات:۴۶۷، سالِ اشاعت:۲۰۲۶ء، قیمت:۹۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۹۱۱۱۴۲۱۵۱

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، **مسافرانِ شبلی منزل** (در عہد شبلی و سلیمان): مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، یوپی، صفحات:۱۶۰، سالِ اشاعت:۲۰۲۶ء، قیمت:۴۵۰روپے، موبائل نمبر:۹۳۳۶۰۱۰۲۲۴

اسلم مرزا، **نشاطِ فکر و نظر** (مجموعۂ مضامین): مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد، صفحات: ۱۸۸، سالِ اشاعت:۲۰۲۶، قیمت:۳۵۰روپے، موبائل نمبر:۹۳۲۵۲۰۳۲۲۷

عقیل عباس طلب گار، **نئی روشنی** (شعری مجموعہ): راجیو انڈسٹریل اسٹیٹ، مون مل، کمپاؤنڈ، ٹی۔ جے۔ روڈ، سِوَری (ویسٹ)، ممبئی، صفحات:۱۹۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۴۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۸۲۰۰۳۸۷۰۴

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول // //	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم // //	--
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

Total Pages: 84 (Including Cover Page)

OCT 2026 Vol- 213(10) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/2026-28

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خود کفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پر مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خود کفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپئے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

7309301663m1@pnb
Scan and pay with any BHIM UPI
BHIM UPI
G Pay Paytm

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان (ڈائرکٹر)